بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیری قندیل ہے ترا دل تو آپ ہے اپنی روشنائی

مینارۂ نور

اشاعتِ سوم

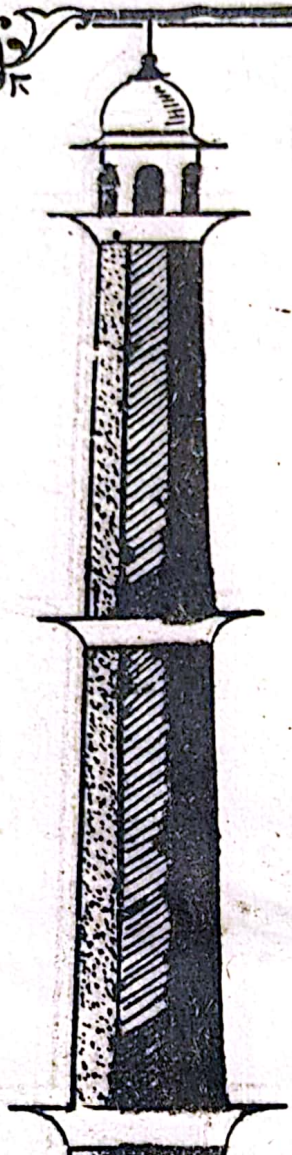

گلہائے عقیدت

بحضور محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ خیرپوری

منجانب: خواجہ خدا بخش اکیڈمی خیرپور

کاتب :- عبدالشکور پیرزادہ (خیرپور شریف)

افشاں پرنٹنگ پریس

شاہی روڈ

رحیم یار خان

حرفِ آغاز

گذشتہ تین سال سے خواجہ خدا بخش اکیڈمی خیرپور ٹامیوالی یوم حضرت خواجہ بموقعہ عرس منانی چلی آ رہی ہے۔ اس تقریبِ سعید پر بہاول پور ڈویژن اور باہر سے دانشور اور صاحب علم حضرات اپنے پُر مغز مقالہ جات آستانہ خواجہ پر پیش کرنے کی غرض سے پوری عقیدت کے ساتھ تشریف لاتے رہے ہیں۔ گذشتہ محرم الحرام میں منائے جانے والے یوم خواجہ پر پڑھے جانے والے مقالہ جات "منارۂ نور" کی اس تیسری اشاعت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ صاحب علم و ادب یہ گرانقدر کاوشیں ہماری آئندہ نسل کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکیں۔

اس ضمن میں میں پورے ملک کے دانشور، علماء، صلحاء اور بالخصوص سجادگان کی توجہ وقت کی اس اہم ترین ضرورت کیطرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آج نہ صرف ہمارا ملک بلکہ بنی نوع انسان جن معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی سطح پر افراط و تفریط کے باعث جس بحران سے دوچار ہیں۔ اس بحران کا حل صرف دینِ شریعت کے نفاذ میں مضمر ہے۔ انسان کے گہرے مشاہدے اور تجربات نے سائنسی علوم میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ ہر روز فکر و فن میں نئی سے نئی حیرت میں ڈال دینے والی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان گرانقدر تبدیلیوں اور ارتقائی عمل سے کائنات کے مادی حسن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس اضافے کے باعث آج کا انسان ماضی کے انسان کیطرح صرف زمین کی پستیوں پہ قانع نہیں بلکہ فضاؤں اور خلاؤں کی وسعتیں اور بلندیاں اس کی جولانگاہ ہیں۔ جہاں زمین سے چاند اور چاند سے مریخ تک کے فاصلے انسان کی عقابی اڑانوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور ہمتِ مردانہ بدستور ان ستاروں اور سیاروں پر کمند آور ہے۔ وہاں آج زمین کی تہوں میں چھپے ہوئے خزانے اور سمندروں کی گہرائیوں میں سربستہ راز انسان کی شبانہ روز جستجو اور تگ و تاز کے سامنے طشت از بام ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات کی یہ رفتار روز بروز تہذیب، تمدن اور ثقافت کے درخشندہ پہلوؤں کو جدید سے جدید تر انداز میں تابندہ و درخشندہ بناتی جا رہی ہے۔

لیکن انسان سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی سطح پر شخصی اقتدار، علاقائی تعصب، معاشی ناہمواری، معاشرتی منافرت اور اخلاقی تنزل سے دوچار ہے۔ انسان خواہ برصغیر میں رہتا ہے یا روس میں، واشنگٹن کا باسی ہے یا پیرس کا قمقموں سے مزین ماحول اور اس کے خوبصورت سبزہ زار انسان کو اپنی پُر مہک آغوش میں لئے ہوئے یا پھر افریقہ کے لق و دق صحرا اس کی زندگی کی شاہراہیں ہیں۔ وہ من حیث الانسان بغیر کسی جغرافیائی تخصیص کے انسانیت کی ایک ہی قدرِ مشترک پر مشتمل بہر رنگ اور بہر طور انسان ہے۔ علاقائی منفعت رنگ و نسل کی تخصیص میں الجھے ہوئے تصورات میں پلی ہوئی بیمار سیاست، جنس پرستی کی آغوش میں کھیلتا ہوا اخلاق اور مہاجنوں کی سود پر فریفتہ ذہنیت کی پیداوار اقتصادی اصول بلاشبہ آج بین الاقوامی سطح پر انسانیت کی دیدہ زیب جبیں پر کوڑھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ مرض ہے جس کے ہولناک اثرات آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں معاشرے کی دامن پھیلاتی ہوئی وسعتیں حقیقتاً ایسی صحت مند معاشرت جنم دینے

سے قاصر ہیں۔ جس معاشرت کا ہر اصول انسانیت کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دلوں میں مستور درد کا مداوا مہیا کر سکے۔ انسانی دماغ اور غور و فکر کی ساری صلاحیتیں دانشور پوری توجہ مبذول کرتے ہوئے کیوں نہ صرف کر دیں وہ حقیقتاً اعلیٰ و ارفع مثالی انصاف، بلند و بالا اخلاقی اصول پوری دنیا کے گوشے گوشے میں رینگتی ہوئی انسانیت کو بلا تخصیص رنگ و نسل کبھی مہیا نہ کر سکیں گے۔ معاشی، سیاسی اور اخلاقی سطح پر ان دانشوروں کی یہ ناکامی نہ صرف پوری انسانیت کی تذلیل ہے بلکہ آخر الامر حالات کا یہ رخ رنگ و نسل کے رسوا کن امتیازات میں الجھ کر انسانی عظمت کی تمام تر تابانی ظلم و جبر کی تباہ کن سیاہی میں گم کر کے ہی رہے گا۔

آج کے انسان کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ سماجی اور معاشی مساوات پر مبنی اور محض انسانیت کی وسیع تر بنیادوں پر قائم معاشرہ ترتیب دیا جائے۔ جسمیں انسان کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو اور اسے تمام تر بنیادی حقوق حاصل رہیں۔ ایسے معاشرے میں انسان کے لئے فکرِ معاش تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہے۔ اس لئے کہ خدا کی زمین پر اسقدر وسائل موجود ہیں جنہیں اگر عدل و انصاف اور انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر استعمال میں لایا جائے تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی انسان بھوکا یا ننگا رہ سکے۔ اسی طرح اگر انسان اپنی ذات میں وہ صفات پیدا کر لے جو اسکی خالق ذات نے اسے عطا کی ہیں۔ ان صفات میں سب سے اعلیٰ صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو طمع و لالچ، خود غرضی، حرص پرستی اور جنسی بے راہ روی میں ملوث نہ ہونے دے۔ انسانی ہمدردی، ایک دوسرے کی عزتِ نفس کا احترام افراد کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہوں۔ محض جاہ پرستی کی اساس پر سیاسی بالا دستی کو گناہ سمجھا جائے۔

ایسے معاشرے کی تشکیل کے بعد ہی موجودہ دور کی مادی ترقی، تہذیب و ثقافت اور تمدن کا ارتقا بنی نوع انسان کے لئے مفید بھی ثابت ہو سکتا ہے اور ایسے ارتقاء کو حقیقی معنوں میں انسانیت کا ارتقاء کہا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا ارتقاء آتشیں اسلحہ سازی یا محض سیاروں تک پرواز کی منزلیں عبور کر لینے سے کبھی حاصل نہ ہوگا۔ ایسے ارتقاء کا حصول صرف قرآن پاک کی تعلیمات کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ قبول کر لینے اور ان تعلیمات کی حقیقی روح کو اسوۂ نبیؐ کے صاف و شفاف آئینے میں دیکھ کر اس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی سطح پر معاشرتی عمل کو ڈھال لیا جائے۔ اسلئے کہ یہی قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبیؐ ہی معاشرتی عمل میں انسانیت کی وہ لازوال اور فطری اقدار مہیا کرتا ہے جس اقدار کے مطابق انسان کا رشتہ ذاتِ خالق کی الوہی صفات سے پھوٹتی ہوئی ذاتِ برحق کے منشاء و ارادہ کی روشنی سے جڑ جاتا ہے۔ اس رشتہ کے جڑ جانے کے بعد انسانی قلوب میں ان الوہی صفات کا عکس طمانیت بخش سکون کی ایک ایسی نورانیت بن جاتا ہے جسمیں سے انسان کی ذہنی صلاحیت معاشرتی زندگی کا ایک ایسا شعور حاصل کرتی ہے۔ جس شعور میں محض خود غرضی پر مبنی جذبات اور سفلی خواہشات کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اور یہ توانا شعور نہ صرف فرد کے انفرادی کردار کو تابناک بنا دیتا ہے بلکہ فرد کے تعلق کو معاشرتی عمل میں افراد کے ساتھ بالکل ٹیکنیکل انداز میں مربوط بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ ارتباط ارتقا پذیر ہوتے ہوتے انسانیت کے فطری اور بنیادی کردار کو اسقدر مضبوط بنا دیتا ہے کہ اس میں انسان کی وہ عظمت جس میں صفاتِ خالق کا عکس ضو فگن ہو کر انسانی قلوب میں تقویٰ کی نورانیت بکھیرتا ہے بالکل اجاگر ہو جاتی ہے اور یوں یہ انسانیت کا سنہری کردار کائنات کا ضمیر بن جاتا ہے۔

قرآن پاک کی اسی آفاقیت اور اسوۂ نبی کی اسی کائنات گیر حکمت عملی کو نہ صرف برصغیر کے اولیاءؒ اور علماءؒ نے اپنی زندگی میں اپنا کر یہ ثابت کیا کہ قرآنی تعلیمات اور اسوۂ ختم الرسل پر عمل پیرا ہونے سے انسان، انسانیت کی کن بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے؟ بلکہ وقت کے جدید تقاضوں اور ماحول کی مناسبت کے مطابق ان اسلامی تعلیمات کو اجتہادی انداز میں معاشرتی عمل کا حصہ بنا دیا۔ اور اپنے قول و فعل سے انتہائی مؤثر انداز میں یہ ثابت کیا کہ اسلامی نظام حیات حقیقتاً دینِ فطرت ہے۔ فطرت کا مزاج نمو پذیر اور تغیر آشنا ہے۔ اس تغیر کے ساتھ ساتھ دینِ مصطفےٰ میں بھی ارتقائی توانائی کا ایسا خزانہ مخفی ہے جس سے وقت کی ہر نئی کروٹ پر معاشرتی عمل میں زندگی سے بھرپور اصول ترتیب پاتے چلے جاتے ہیں اور یہ تنوع پذیر اصول تا قیامت انسان کی ہر نئی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے اس کے قلبی رشتوں کو بھی ذاتِ خالق سے جوڑے رکھیں گے۔ ان اصولوں سے روگردانی براہ راست فطرت سے تصادم لینے کے مترادف ہے۔ فطرت سے تصادم محض تباہی اور فطرت کے مزاج کو سمجھ کر اس کی مطابقت پوری زندگی ہی زندگی ہے۔

آج ہم جب ان بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی مزارات اور خانقاہوں پر اس نیت اور ارادہ سے جاتے ہیں کہ یہاں کی روح پرور فضاؤں اور ماحول میں اُن صاحبِ دل بزرگان کی زندگی کے نمونے دیکھیں جو محض زندگی، خالص محبت اور رموزِ معرفت سے مزین نگاہ پر مشتمل ہیں۔ ان فقید المثال عملی نمونوں سے استفادہ کریں تو یہ تمنا حسرت آشنا ہی رہتی ہے اور انسان مایوسی کی دھند الجھتا ہوا اقبال کی زبان میں یوں شکوہ سنج اٹھتا ہے کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

کبھی ہم نے سوچا کہ یہ کیوں ہے؟ میں انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کرونگا کہ یہ صرف اس لئے ہے کہ برصغیر کے ان اولیاءؒ اور صلحاءؒ کی تحقیق پر مبنی ان کے علمی کارناموں اور ان کی عملی زندگی کو عموماً ہم سب نے اور بالخصوص ان کے سجادگان حضرات نے بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔ سجادگان حضرات انکے نام پر مالی مفادات تو حاصل کرتے ہیں اور ایسی عظیم شخصیتوں کی نسبت سے نام و نمود کے رسیا تو ہیں لیکن ان کے جانشین اور انکے وارث ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں بہت کم محسوس کیا جاتا ہے۔ یہ بے اعتنائی موجودہ دور میں بطور خاص ایک سنگین غلطی ہے۔ جس کا ازالہ اب نہ کیا گیا تو یہ وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔

بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے یہ مزارات اپنی زبانِ حال سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو احکاماتِ ربانی اور اسوۂ نبیؐ میں ضم کر دیا اور اس عمل سے جس معاشرتی کردار نے جنم لیا اس میں ایک عام آدمی سے لیکر خاص آدمی تک کی آدمیت انسانی معاشرے کا حسن بن کر رہ گئی۔ ایک ایک ایسا حسن جس میں تقوی، انسانی ہمدردی، ہر آدمی کے فطری حقوق کے تحفظ، امن و آشتی اور ایک بہترین اخلاق جس میں طہارتِ فکر و نظر کے ہر پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ کو درخشندہ ستاروں کی حیثیت حاصل تھی۔ ان تمام آدمیت کی سنہری اقدار کو ان بزرگان نے نہ صرف عبادات کے ذریعے اپنا رشتہ ذاتِ خالق سے جوڑ کر اپنی خودی کو پہچانا اور اس پہچان سے نہ صرف اپنے اندر کے انسان کو حقیقی انسانیت کے زیور سے مزین کیا بلکہ ان بہترین شرعی اور حقیقتاً فطری اور انسانی اقدار کو بیعت، درس تدریس اور تبلیغ کے ذریعے ہر ممکن حد تک ایک تنظیم کے ساتھ ہر عام آدمی تک پہنچانے میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ مگر یہ ہماری ملی زندگی کا المیہ ہے کہ ہم نے ان حضرات کے عظیم طرزِ عمل کو نہ خود اپنی عملی زندگی میں اپنایا ہے اور نہ ہی انکی تعلیمات اور ملفوظات کو اشاعت کے ذریعے اپنی موجودہ نسل تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے تاکہ یہ انسانیت کا عظیم کردار آج کے معاشرے میں ہماری موجودہ نسل کی زندگی کا بھی حصہ بن سکے۔ بزرگان کے تبرکات اور انکی تحریریں تو ہمیں یہ یاد دلاتی ہیں کہ ہم ان بزرگان کے سچے پیروکار بنیں اور انکے پاکیزہ خیالات کو اپنی عملی زندگی میں اپنائیں۔ یہ خیالات انکی زندگی کے مشاہدات کا نچوڑ تھے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہم ان کی عملی، تحقیقی اور فکری کاوشوں کو ملفوظات یا تبرکات کا نام دیکر صندوقوں میں لوہے کے بیٹھے ہیں انکی اشاعت کا کوئی بندوبست نہیں کیا جاتا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ انکی فاضلانہ جدوجہد موجودہ نسل تک پہنچنے کی بجائے آخر کار دیمک کی نظر ہو جائیگی۔ بہرحال میں ایکبار پھر سجادگان کے حضور میں التجا کرونگا کہ آیئے آج ہم یہ عہد کریں کہ ہم اپنے بزرگان، علماء اور صلحاء کی روایات اور انکی طرزِ زندگی کو نہ صرف عملی زندگی میں اپنائیں گے بلکہ ان کے گرانقدر ارشادات کو عام آدمی تک پہنچانے کا بھی فوراً [illegible] اہتمام کریں [illegible] دلوں میں [illegible]

جائزہ

مجاہدینِ اسلام کے قدم جہاں بھی پہنچے وہ خطہ نورِ اسلام سے منور ہوا۔ بزرگانِ دین نے قدم رنجہ فرمایا اور اسوۂ رسولؐ کا نمونہ بن کر تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیا۔

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی　　بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

بزرگانِ دین کی مساعی سے جہاں اہالیانِ برصغیر دین و ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ وہاں مظلوم انسانیت نے صدیوں کی غلامی سے نجات حاصل کی اور دینِ متین کی روشنی میں زندگی کی اعلیٰ قدروں سے آشنا ہوئی۔ خواجہ خدا بخش اکیڈیمی نے بزرگانِ دین کی تعلیمات اور دینی خدمات پر تحقیقی کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ "منارۂ نور" کی گذشتہ اشاعت میں ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء کو منائے جانے والے یومِ خواجہ خدا بخش کے موقع پر پیش کئے گئے مقالات شائع ہوئے تھے۔ اہلِ علم و دانش نے ان مقالات کو بہت پسند کیا اور خواجہ خدا بخش اکیڈیمی کی کارکردگی کو سراہا۔ اکیڈیمی کو اہلِ علم و دانش کی طرف سے تعریفی خطوط بھی موصول ہوئے۔

جناب ایم اے مجید پیرزادہ کے خطبہ استقبالیہ اور جناب محمد نواز انیس پیرزادہ کے مقالہ "خواجہ خدا بخشؒ اور اصلاحِ معاشرہ" کی بے حد تعریف کی گئی۔

خواجہ خدا بخش اکیڈیمی خیرپور کے زیرِ اہتمام حسبِ دستورِ سابق ۱۸ جنوری ۱۹۷۷ء کو "یومِ خواجہ خدا بخشؒ" کی تقریب کے سلسلے میں مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت صدر اکیڈیمی جناب ایم اے مجید پیرزادہ نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب پروفیسر منور علی خاں پرنسپل گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور تھے۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض جناب مختار احمد پیرزادہ نے انجام دیئے۔ ان حضرات کے علاوہ جناب مولانا مفتی غلام قادر، جناب سید مسعود حسن شہاب، جناب احمد غزالی، جناب پروفیسر الٰہی بخش حامد اللہ، جناب عاشق مصطفیٰ، راقم الحروف، جناب عبدالشکور پیرزادہ اور جناب طارق انیس پیرزادہ نے حضرت خواجہ خدا بخش رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت، کمالات اور مسئلہ تصوف پر در ج پر مقالات پڑھے۔ اہلِ خیرپور اور پیرزادگانِ خیرپور کے علاوہ بہاول پور ڈویژن اور ملتان ڈویژن کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے معزز مہمانوں نے اجلاس کی رونق بڑھائی اور فاضل مقررین کی ایمان افروز نگارشات سے مستفید ہوئے۔ اجلاس کے بعد شعرائے کرام نے حضرت خواجہ خدا بخشؒ کے حضور منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اسی روز بعد از نمازِ عشاء خواجہ خدا بخش اکیڈیمی کے تعاون سے بزمِ ریاض رحمانی خیرپور کے زیرِ اہتمام محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت جناب محمد نواز انیس پیرزادہ نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب نقوی احمد پوری کے علاوہ جناب ریاض رحمانی سرپرست خواجہ خدا بخش اکیڈیمی، مظہر مسعود، راقم الحروف، رفیق احمد پوری، سرور قریشی، منظور خاکی، مشکور قطب پوری، عارف خاکی، شبیر رحمانی، ظفر بھٹی اور دوسرے شعراء نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جناب ایم اے مجید پیرزادہ نے اپنے مقالے "برصغیر میں اولیائے چشت کی دینی خدمات" میں اولیائے کرام خصوصاً بزرگانِ چشت کی مساعی تبلیغِ دین پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان پر مسلمان بادشاہوں کے حملوں کا مقصد زیادہ تر کشور کشائی تھا۔ لیکن بزرگانِ دین نے کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے اشاعتِ دینِ مصطفےٰ کا مشن اپنایا۔ اور سلسلۂ چشتیہ کے بزرگان نے اس مشن کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ آپ نے کہا کہ یہ بزرگان قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا منہ بولتا نمونہ اور مجسمۂ عمل تھے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بے عمل اور بے کردار انسان کی زبان سے نکلے ہوئے پند و ہدایت کے دفتر کے دفتر کبھی بھی کسی کے لوحِ دل پر نقش نہیں ہونگے۔ دل تو صرف ایسی بات کو قبول کرتا ہے جس کے پیچھے عمل اور کردار کی بے پناہ قوت سرگرمِ عمل ہو

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ سہی ۔۔۔ آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

آپ نے کہا کہ اللہ کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں سے بھی محبت کی جاتی ہے۔ کیونکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ جو انسان چاہتا ہے کہ خدا اس سے محبت کرے اُسے چاہیئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

آپ نے صوفیاء کی روحانی قوت کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ ایک مغربی مفکر اے آر گیبز اسلامی کلچر میں لکھتا ہے کہ تاریخِ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا۔ لیکن وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا اندازِ فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا۔ اور اس کو اتنی قوت بخش دیتا تھا۔ کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

مہمانِ خصوصی جناب پروفیسر منور علی خاں نے "شریعت و طریقت۔ ایک حقیقت پسندانہ جائزہ" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ آپ نے شریعت اور طریقت کی اصطلاحوں کی تعریف کی اور ان کے برائے نام فرق کی تصریح کی۔ آپ نے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مکتوبات کے حوالے سے بتایا کہ اہلِ طریقت کو اپنے عقائد اور اپنے اعمال میں ہمیشہ کتاب و سنت ہی کو اپنی مستقل راہ بنانا چاہیئے۔ صحیح طریقت وہ ہے جسے علمائے اہلِ سنت نے کتاب و سنت کے حوالے سے مرتب کیا ہے اور کبھی کوئی کیفیت کتاب و سنت کے خلاف کشف و الہام کے ذریعے محسوس ہو تو اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔

جناب مولانا مفتی غلام قادر نے "مناقبِ اولیا" کے موضوع پر اپنے خیالاتِ عالیہ کا اظہار فرمایا۔ آپ نے تفسیر روح المعانی کے حوالے سے بتایا کہ جن چیزوں کے خوف و غم میں عام طور سے اہلِ دنیا مبتلا رہتے ہیں۔ کہ دنیاوی مقاصد، آرام و راحت، عزت و دولت میں ذرا سی کمی ہو جانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی تکلیف و پریشانی کے خوف سے ان کے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں۔ اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بلند و بالا ہوتا ہے۔ ان کی نظر میں نہ دنیا کی فانی عزت و دولت، راحت و آرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں۔ اور نہ یہاں محنت و کلفت اور رنج کچھ قابلِ التفات ہے۔

جناب مسعود حسن شہاب نے "بہاولپور کی روحانی ترقی میں خانوادۂ چشتیہ کا حصہ" کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ آپ نے بتایا کہ یہاں سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں اور خاص طور پر حضرت خواجہ خدا بخش نے کیا دینی خدمات انجام دیں۔

CamScanner

جناب احمد غزالی نے بزرگان دین کی روحانی عظمت اور اولوالعزمی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جناب پروفیسر الٰہی بخش جار اللہ اور جناب پروفیسر عاشق مصطفےٰ نے علمائے حق کے علمی اور دینی کارہائے نمایاں پر بلیغ تقاریر سے مستفیض کیا۔ جناب مختار احمد پیرزادہ نے "عرس کیوں منائے جاتے ہیں" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ آپ نے کہا کہ معاشرے کا ذہن کچھ اس طرح بدلا جا رہا ہے کہ نہ صرف موجودہ نسل معرفت، روحانیت اور اولیاء اللہ کے روحانی فیوض و برکات سے دور ہوتی جا رہی ہے بلکہ موجودہ نسل سے پہلے کے لوگ بھی بزرگانِ دین کے عرسوں پر عاجزی، انکساری اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ عبادات اور تلاوتِ قرآنِ کریم کے ذریعے صاحبِ مزار کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کر کے اولیاء اللہ سے روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے۔ اب زیادہ تر عرسوں کو میلے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ جہاں دنیاوی دلچسپیوں کے تفریحی مشاغل موجود ہوتے ہیں اور ان مشاغل میں ڈوب کر یہ لوگ اپنا دامن برائیوں سے آلودہ کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بالکل بھول جاتے ہیں کہ ولی اللہ کے عرسوں میں شرکت کرنے کا اصل مدعا کیا ہے۔ آپ نے کہا کہ مغربی دنیا میں اب یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ روح کی تسکین بہت ضروری ہے اور بہت سے لوگ دنیا کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود ساختہ عبادات کے طریقوں کو اختیار کر کے روحانی تسکین کے متلاشی ہیں۔ ہم اپنی کوشش سے ولی اللہ کرام کی زندگی کے منور گوشے ان کے اعمال اور ان کے وہ طریقے جو روح کی تسکین اور اللہ کی پہچان کا ذریعہ تھے۔ آج کی بھٹکی ہوئی دنیا کے سامنے ایک مربوط اور باقاعدہ طریقے سے مختلف تصانیف اور مضامین کی صورت میں پیش کریں تو یہ بات بہت حد تک ممکن ہے کہ دوسری قومیں بالکل اسی طرح اسلام کی طرف کشش محسوس کریں گی جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے صوفیائے کرام کی تعلیمات اور ان کے اعمالِ صالح کو دیکھ کر اسلام میں دلچسپی لی تھی اور نورِ اسلام سے اپنے دلوں کو منور کیا تھا۔ آپ نے کہا کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی قبور کو مقامِ عبرت کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان قبور پر عبرت حاصل کرنے کے خیال سے جائے اور ان کی قبور پر فاتحہ پڑھے تو اس طرح بزرگانِ دین اس کی دعاؤں کو بارگاہِ ایزدی میں مقبول کرانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

جناب عبدالشکور پیرزادہ نے "اعلائے کلمۃ الحق اور اولیاء اللہ" کے موضوع پر بصیرت افروز مقالہ جناب طارق انیس پیرزادہ نے نئی نسل کے لئے حضرت خواجہؒ کی تعلیمات کی ضرورت پر مقالہ پڑھا۔ جناب فضل اللہ زبیری اس اجلاس میں شرکت نہ فرما سکے تھے۔ مگر ان کا مقالہ "منارہ نور" کی زیرِ نظر اشاعت میں عمل کارروائی کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ یہ تمام مقالات اہلِ علم کی روحانی تسکین کا باعث بنیں گے۔ ہم اہلِ علم اور اہلِ الرائے کے مشوروں کا خیر مقدم کریں گے اور تعاون کی توقع رکھیں گے۔

رشید عثمانی
جنرل سیکریٹری اکیڈمی

مجید پیرزادہ
صدر خواجہ خدابخش اکیڈمی

برِصغیر میں اولیائے چشت کی دینی خدمات

مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان پر پے در پے حملوں کی یورش کی تو ان کے پیشِ نظر زیادہ تر مقصد رہا وہ کشور کشائی تھا۔ انہوں نے سنجیدگی سے اسلامی تمدن اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے غور و تجویز نہ کی۔ یہ بزرگانِ دین ہی تھے۔ جنہوں نے اس برصغیر میں کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے اشاعتِ دینِ مصطفٰی کا مشن اپنایا۔ اگر بزرگانِ چشت کی تاریخ اور ان کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگانِ عظام نے ہندوستان کے خطۂ کفر والحاد میں سب سے پہلے دینی خدمات کا آغاز کیا اور اسے پروان چڑھایا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اولیائے کرام کی ہندوستان میں آمد کا بھرپور سلسلہ مسلمان بادشاہوں کی آمد کے ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ اس برصغیر میں صوفیاء کی آمد کی صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چل سکا البتہ پروفیسر اے آر ترپاٹھی کی تحریروں سے خبر ملتی ہے کہ محمد بن بختیار خلجی کی فتح سنہ ۱۲۰۰ء سے قبل یہاں پر بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام پہنچ چکے تھے تاہم سب سے پہلے سلسلۂ چشتیہ کے ذریعے ۱۲۳۵ء میں باقاعدہ طریق پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی نے اشاعتِ دینِ مصطفٰی کی شمع روشن کی۔ قبل اس کے کہ بزرگانِ چشت کی دینی خدمات پر تبصرہ کیا جائے یہ ضروری ہے کہ اس امر پر روشنی ڈالی جائے کہ لفظ چشتی کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی؟

تاریخ اور مستند تذکروں کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے چشتی کا لفظ حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی کے نام کے ساتھ لکھا گیا۔ "تذکرۂ اولیا" میں درج ہے کہ خواجہ ابو اسحاق جب حضرت خواجہ ممشاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ آپ کا نام! عرض کیا ابو اسحاق شامی آپ نے فرمایا کہ آج سے لوگ تجھے ابو اسحاق چشتی کہہ کر پکاریں گے۔ چشت اور اس کے نواح کے لوگ تجھ سے ہدایت پائیں گے۔ اور ہر وہ شخص جو تیرے سلسلۂ ارادت میں داخل ہوگا اسے قیامت تک چشتی کہہ کر پکارا جائے گا۔ چنانچہ ابو اسحاق کی کوشش سے قصبۂ چشت سلسلۂ چشتیہ کا عظیم اور پہلا روحانی مرکز بنا اور سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت عثمان ہارونیؒ سے خرقہ سلوک و طریقت حاصل فرما کر سرزمینِ ہند کو شمعِ رسالت کی ضیاپاشیوں سے منور کرنے کے لئے تشریف لائے اور اجمیر شریف کو اپنا مرکز بنا کر سلسلۂ تبلیغ دین متین شروع فرمایا۔ میر خورد نے آپ کو اپنے تذکروں میں نائبِ رسول اللہ فی الہند لکھا ہے۔

ان دنوں اجمیر شریف ہندو سامراج کا مضبوط گڑھ تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پرتھوی راج کی حکمرانی تھی۔ انسان کو زندگی میں مقصد حاصل کرنے کیلئے بڑی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ راستے میں

سامنے پڑتے ہیں۔ سرکش حوادث کی گردنیں خم کرنی پڑتی ہیں۔ خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر بھی چونکہ ایک عظیم الشان نصب العین تھا اس لئے آپ نے اپنے غیر معمولی عزم و استقلال اور خود اعتمادی کا ثبوت دیتے ہوئے اجمیر شریف ہی کو اپنا مسکن بنانا پسند فرمایا اور کفر کی اس گھٹا ٹوپ اور اندھیری وادی میں حق سبحانہ و تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول عربی کی تعلیمات کو پھیلانے کا آغاز فرمایا۔ سچ ہی تو ہے کہ ؎

جب تک لہو جگر کا نہ ہو زینتِ چمن　　ملتی نہیں کسی کو بہاروں کی زندگی

بہر حال حضرت خواجہ اجمیریؒ کی تشریف آوری سے ہندوستان میں ایک عظیم روحانی سماجی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ اس زمانہ میں سماجی زندگی نہایت خراب حالت کا شکار تھی۔ شہری اور ملکی زندگی چھوت چھات کی عفریت نے نگل لی تھی۔ زندگی کا آرام و آسائش صرف اونچی ذات کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ غریب عوام مایوسی و محرومی کا شکار تھے اور مصائب و آلام میں گھرے ہوئے تھے۔ اسی ماحول کی ایک تصویر مشہور مؤرخ البیرونی نے کتاب الہند میں کچھ یوں پیش کی ہے رقمطراز ہے کہ "زندگی انسان کیلئے بوجھ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آدمی بنایا تھا۔ لیکن اس کے بندوں نے انہیں جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔" ایسی گھٹن اور محرومی کے دور میں خواجہ اجمیریؒ نے نظریۂ توحید اور مساوات محمدی کو عملی حیثیت سے پیش فرما کر ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب کی اساس ڈال دی۔ آپ کی اپنی زندگی بڑی سادہ اور دلکش تھی۔ ہندوستان میں سماجی انقلاب کا یہ علمبردار خود ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں ایک پھٹی ہوئی دوتہی میں لیٹا ہوا رہتا تھا۔ اور پانچ مثقال سے زیادہ کی روٹی بھی افطار میں میسر نہ آتی مگر سبحان اللہ نظر کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ جس طرف اٹھی گناہ و معصیت کے سوتے خشک ہو کر رہ گئے۔ علامہ اقبالؒ نے ایسی ہی نظر کے لئے تو کہا تھا ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بزرگانِ چشت اسلام اور اس کے اصولوں کی اشاعت کے لئے اس طرزِ عمل کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ کہ جب تک انسان کی اپنی زندگی اسلامی اصولوں کی تفسیر نہ بن جائے۔ دوسروں کو ان اصولوں سے رغبت اور دلچسپی پیدا نہیں کرائی جاسکتی۔ مغربی مفکر کارلائل خواجہ یثرب کے متعلق اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے کہ "وہ نور کے ایک بہتے ہوئے چشمے کی مانند تھے۔ جو ان کے نزدیک آتا سیراب ہو جاتا۔"

حضرت نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ "ہر چہ علماء بزبان دعوت کنند مشائخ باعمال دعوت کنند۔"

علامہ اقبالؒ نے اپنی زبان میں اس کی کچھ یوں تفسیر بیان فرمائی کہ ؎

صد کتاب آموزی از اہل ہنر　　خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر

آخر ان بزرگان کی زبان اور نظر میں اس قدر تاثیر و اعجاز کیوں تھا؟ بزرگوں کی زندگی اور کردار سے خبر ملتی ہے کہ وہ خود قرآن حکیم کی تعلیمات کا منہ بولتا نمونہ اور مجسمۂ عمل ہوتے تھے۔ ان کا کردار اور ان کا عمل اس قدر دلکش اور جاذب ہوتا تھا کہ لوگ خود بخود ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور دینِ اسلام کی نعمت سے

CS CamScanner

مالا مال ہو جاتے۔ پند و نصیحت کے چند مرصع جملے کہہ دینا تو کوئی مشکل بات نہیں مگر فی الحقیقت ان جملوں کے کہنے والوں کو عملی صلاحیتوں اور اخلاقی قدروں کا حامل ہونا چاہیئے قرآن کریم کا ارشاد ہے "اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" "کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو"

یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ کہ بے عمل اور بے کردار انسان کی زبان سے نکلے ہوئے پند و ہدایت کے دفتر کے دفتر کبھی بھی کسی کے لوحِ دل پر نقش نہیں ہوں گے۔ دل تو صرف ایسی بات کو قبول کرتا ہے جس کے پیچھے عمل اور کردار کی بے پناہ قوت سرگرمِ عمل ہو۔ واعظ کا ہر اک اشارہ بجا، تقریر بہت دلچسپ سہی، آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پر یقین کا نور نہیں۔ چہروں پر نورِ یقین اور آنکھوں میں سرورِ عشق اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب اخلاق کا درس دینے والا خود اتباعِ محمدی کا نمونہ ہو۔ مولانا بدرالدین اسحاقؒ فرماتے ہیں۔ کہ بابا فریدالدین شکر گنجؒ کو دیکھا۔ ایک بادشاہ ہے۔ جو اپنے سینۂ صافی اور دلکشا تقریر سے آنے والوں کے دلی بھید بیان کرتا اور ان کے دلوں کو اچک لیتا ہے۔ مناقب فخریہ کا مصنف حضرت فخرالدین دہلویؒ کے متعلق لکھتا ہے کہ گویا ایک شراب تھی۔ جو جامِ دل میں ڈال دی گئی یا ایک آگ تھی جو میرے سینے میں بھر دی گئی۔

سلسلہ چشتیہ کا دورِ اوّل حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے شروع ہو کر حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ پر ختم ہوتا ہے۔ خواجہ اجمیریؒ نے اس سلسلہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت بختیار کاکیؒ اور بابا فریدالدین شکر گنجؒ نے اس سلسلہ کی تنظیم کی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اسے بامِ عروج تک پہنچایا۔

آج بھی ان بزرگان کی زندگی کا مطالعہ اور تجزیہ ہمیں صراطِ مستقیم کی طرف لانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ حقیقت میں آج بھی ہمارے لئے روشنی کا ایک مینار ہیں۔ میر خود نے کہا تھا۔ کہ یہ بزرگ خدا کے دین اور پیغمبر کی سنت کے لئے مضبوط قلعے تھے۔

قرآن حکیم میں جگہ جگہ اخلاق کی درستی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اور ان بزرگان کا مسلک بھی یہی تھا۔ کہ مکارمِ اخلاق کو سنوارا جائے۔ اللہ کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں سے بھی محبت کیجائے کیونکہ بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ "خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ جو انسان چاہتا ہے کہ خدا اس سے محبت کرے اسے چاہیئے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہو گی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان پر اکثر یہ اشعار جاری رہتے تھے ؎

ہر کہ مارا رنج دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد
ہر کہ خارے افگند در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفتہ بے خار باد

مستشرقین جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا۔ پروفیسر ہٹی نے HISTORY OF ARABS میں لکھا ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے۔ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں، مذہبی اسلام نے بعض شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ "اسلامک ٹیکسیشن ان کلاسک پیریڈ میں" فریڈسے لوکے گا "اس بات پر اظہار حیرت کرتا ہے کہ گو اسلام کا سیاسی زوال تو بارہا ہوا۔ مگر روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ ایک مغربی مفکر اے آر گبز اسلامک کلچر میں لکھتا ہے کہ تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا۔ لیکن وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا اندازِ فکر فوراً اسکی مدد کو آجاتا تھا۔ اور اس میں اتنی قوت بخش دیتا تھا۔ کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

مذکورہ مغربی مفکرین کے خیالات و افکار کی روشنی میں اگر اسلامی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کو ماننا ہی پڑے گا۔ کہ " يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ اور يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کے ان علمبرداروں نے نامساعد حالات اور غیر موافق معاشرتی ماحول کے باوجود پورے عزم و استقلال سے گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی، معاشرہ کے فاسد عناصر کو راہ راست پر لانے کیلئے مستعدی دکھائی۔ مسلمانوں کی سیاسی ترقی جب بام عروج پر تھی تو اس سرفرازی و سربلندی کا سہرا بھی یقیناً بزرگانِ دین کے سر رہا کیونکہ یہی تو وہ لوگ تھے۔ جو عوام کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے قوم کے اخلاقی مزاج کو بگڑنے سے بچانے اور مادیت کے طوفان کو روکنے کے لئے سراپا عمل بنے رہتے تھے اور انہیں ہمیشہ یہی فکر لاحق رہتی کہ کہیں سلطنت کے انحطاط و زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی روح، اسلامی فکر، اسلامی کردار اور اسلامی سرمایہ حیات تاراج نہ ہو جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت چراغ دہلویؒ کا وصال ہوا اور سلسلہ چشتیہ کا دورِ اول اور نظامِ مرکزی ختم ہو گیا تو فیروز شاہ کے وصال کے بعد دہلی کی مرکزی حیثیت بھی فنا ہو گئی۔ سلطنتِ دہلی نے دم توڑ دیا۔ علمی اور مذہبی محفلیں سرد پڑ گئیں۔ کچھ ایسا عالم تھا ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

بزرگانِ چشت کا ہمیشہ یہ طرز اور اصولِ زندگی رہا ہے کہ انہوں نے بادشاہوں کے دربار سے اپنی وابستگی کو پسند نہ فرمایا۔ لیکن جب محمد تغلق نے دارالسلطنت دہلی سے دکن منتقل کرنے کے لئے سوچا۔ تو صوفیائے کرام پر بھی زور دیا کہ وہ بھی دہلی سے اپنے سلسلہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر کے دکن جا کر تبلیغ کا کام شروع کریں۔ چنانچہ سلطان تغلق نے اپنے دربار میں مولانا فخر الدین زرادیؒ، مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ

CamScanner

نصیر الدین چراغ دہلویؒ کو بلایا اور دکن کی طرف جانے کی تلقین کی۔ جب درباریوں نے سلطان کے حکم کی تعمیل نہ کی تو اس نے ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ شروع کر دیا۔ اس طرح بزرگان عظام کا وقت اشاعت دین متین کی بجائے اپنی مدافعت میں صرف ہونے لگا۔ اور ان کا ذہنی سکون درہم برہم ہونے لگا۔ چنانچہ سلسلہ چشتیہ کا مرکزی نظام درہم برہم ہو گیا اور بزرگان دین بنگال، دکن، گجرات اور مالوہ میں پھیل گئے اور اپنی خانقاہیں قائم کر کے سلسلہ رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔ لیکن بالآخر سلسلہ چشتیہ کی نشاۃ ثانیہ کا وقت آیا اور حضرت شاہ کلیم اللہؒ جہاں آبادی نے اس سلسلہ کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیا۔ اور اپنی شب و روز کی محنت اور کاوش سے اس سلسلہ کی تجدید و احیاء کا آغاز کیا۔ حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ نے اپنی شعلہ نفسی سے اس میں روح پھونکی اور پھر اپنے جگر گوشہ شاہ فخر الدین دہلویؒ کو مسند ارشاد دے کر جان سپرد جاں آفریں فرمائی۔

آپ نے جس وقت مسند ارشاد سنبھالی اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی زندگی تنزل اور انحطاط کی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ مگر آپ نے حق و صداقت اور تبلیغ دین محمدی کیلئے دن رات ایک کر کے جمود مرگ کو ایک صحت مند زندگی میں تبدیل فرما دیا۔ اور ایک بار پھر سلسلۂ چشتیہ کی عظمت رفتہ کو سہارا اور سنبھالا دیا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو آپ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ چنانچہ اپنے دیوان میں جگہ جگہ شاہ فخر الدین دہلوی کا ذکر کیا ہے۔

هر شئے پاک ہوا فخر الدین　　ذات کعبہ دو جہاں فخر الدین
ایک جہاں فخر جہاں کہتا ہے　　پر ہے فخر دو جہاں فخر الدین
میں گدا ہوں تیرے در کا ظفر　　جاؤں اس در سے کہاں فخر الدین

کروں کیا عرض عیاں ہے تم پر　　میرا سب راز نہاں فخر الدین
اے ظفر ہر نفس ہر ساعت　　شغل دل ورد زباں فخر الدین

آپ نے خواجہ نور محمد مہارویؒ علیہ الرحمت کے ذریعے سلسلہ چشتیہ کا فیض پنجاب میں پہنچایا۔ چنانچہ اس مرد کامل نے ملتان شریف، تونسہ شریف، کوٹ مٹھن شریف اور خیر پور شریف میں حضرت خواجہ خدا بخش علیہ الرحمت کی شکل میں دین محمدی کی قندیلیں روشن فرمائیں۔

"گلشن ابرار" کے مصنف رقمطراز ہیں کہ ملتان حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے قبضہ میں تھا۔ کسی اور ولی اللہ کو یہاں عمل دخل نہ تھا۔ ایک روز حضرت قبلہ عالمؒ نے فرمایا کہ بے شک اس سے پہلے ملتان حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے قبضہ میں رہا۔ مگر آج رات ملتان ہمیں بخشا گیا ہے۔ چنانچہ قبلہ عالم کے حکم پر ان کے خلیفہ مجاز حضرت حافظ جمال اللہؒ ملتان تشریف لے گئے۔ اور غوث پاک حضرت زکریا ملتانیؒ کے آستان مبارک پر حضرت خواجہ خدا بخش علیہ الرحمتہ خیر پوری کو بیعت فرمایا۔ چنانچہ اسی روز سے ملتان میں سلسلۂ چشتیہ کا فیض عام ہوا۔ اور آج ہم اسی مرد کامل اور سلسلۂ چشتیہ کے واجب الاحترام شیخ حضرت خواجہ خدا بخشؒ کے آستان عالیہ پر ذکر خیر گان چشت میں عقیدت، دانشوراں سے ذرا لیے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔۔۔۔۔

بقول حضرت خواجہ محمد شاد علیہ الرحمت قیامت تک بزرگان چشت کا ذکر مبارک اور فیضان جاری رہے گا۔

هر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد ز عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

منور علی خاں
پرنسپل ایس ، ای کالج بہاولپور

شریعت و طریقت ۔ ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

عربی کا ایک مقولہ چلا آتا ہے ۔ جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے ۔ کہ فقہ تو پڑھی نہیں لیکن فقہ پر کتاب لکھ ڈالی ۔ بعینہٖ یہی کیفیت میری ہے ۔ کہ تصوف کی الف ب سے بھی واقف نہیں لیکن شریعت اور طریقت کا جائزہ لینے کی جسارت کر لی ہے ۔ اس طالبعلمانہ کوشش کے لئے میں نے مولانا الٰہی بخش عبداللہ صاحب اور مختار احمد پیرزادہ صاحب کے اصرار پر قلم اٹھا آیا ہے ۔ لہٰذا سامعین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ آپ عربی کے مشہور مقولے "اُنْظُرْ مَا قَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ" کے مطابق بات کہنے والے پر نظر نہ ڈالیے بلکہ یہ دیکھئے کہ بات کیا کہی جا رہی ہے ۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ آپ حضرات نے اس مقدس ماحول میں مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع عطا فرمایا ۔ جس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں ۔

حضرات ! اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اسلام انسانوں کیلئے ایک مکمل ضابطۂ حیات اور ایک جامع ترین پیغام رحمت و رشد و ہدایت لے کر آیا اور ان کی ذہنی اور عقلی ، اخلاقی و معاشرتی ، جسمانی و روحانی ۔ انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کی کفالت کا ذمہ دار بنا ۔ اس نظام تربیت کا مقصود اصلی انسانوں کو خدا رسی اور خدا شناسی کی تعلیم دینا تھا ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دین نظام میں دو اصطلاحیں مروج رہیں ۔ ایک شریعت اور دوسری طریقت ۔ حالانکہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے ۔ یعنی انسانوں کو خدا رسی اور خدا شناسی کی تعلیم دینا ۔ لیکن امتداد زمانہ سے ان دونوں اصطلاحوں نے علیحدہ علیحدہ مسلک کی شکل اختیار کر لی اگر قرن اولیٰ کا جائزہ لیا جائے تو اکابرین شریعت و طریقت کے شعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں میں اگر کوئی فرق ہے بھی تو محض درجے کا ہے ۔ یعنی شریعت جب اپنے نکتۂ کمال کو پہنچتی ہے تو اس کو طریقت کا نام دیا جاتا ہے ۔ اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ اتباع رسولؐ جب تک ظاہر و خارج اعضاء و جوارح تک محدود ہے ۔ اس کا نام شریعت ہے ۔ اور جب قلب باطن بھی اسی نور محبت سے منور ہو گیا تو یہی طریقت ہے ۔ ایک شخص نے نماز ظاہری ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق پڑھ لی تو اس کی نماز شریعت کی نظر میں ہو گئی ۔ فقیہ اسے کافی سمجھ لے گا ۔ لیکن اہل طریقت اس پر مطمئن نہ ہوں گے ۔ ان کا اس پر اصرار ہو گا کہ جس طرح چہرہ خانہ کعبہ کی طرف رہا ۔ قلب رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے ۔ اور جس طرح جسم و لباس ظاہری نجاست سے پاک رہا ۔ دل و دماغ بھی اندرونی تاریکیوں ، الائشوں اور پراگندہ خیالیوں سے صاف رہے ۔ شریعت پر یہ اضافہ شریعت کی مخالفت نہیں بلکہ مقصود شریعت کی تکمیل ہے اور شریعت کی تکمیل و اتمام ہی نام طریقت ہے ۔

طریقت کے قدیم اکابرین طریقت کو شریعت کے مقابلہ میں ایک علیحدہ مسلک کی حیثیت سے کبھی نہیں لاتے تھے۔ بلکہ شریعت کے ماتحت اس پاکیزہ ترین صورت کو طریقت کہتے تھے۔ وہ شریعت کو طریقت پر مقدم رکھتے تھے۔ اور طریقت کو صرف اس لئے عزیز و محبوب رکھتے تھے۔ کہ وہ ان کی نظر میں اسلام کی خالص ترین اور پاکیزہ ترین صورت تھی۔ ان کے نزدیک طریقت کا مفہوم محض اس قدر تھا۔ کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے۔ اسوۂ رسول و صحابہ کو دلیل راہ رکھا جائے۔ اوامر و نواہی کی تعمیل کی جائے۔ طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے۔ قلب کو محبت و تعلق ماسوا سے الگ کیا جائے۔ نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے۔ اور صفائے معاملات و تزکیۂ باطن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے پائے۔ اگر اس تربیت کی روشنی میں حضور سرور کائنات اور صحابۂ کرام کے طرز عمل کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہی وہ طریقت تھی۔ جس پر خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کار فرما رہے۔ یہی طریقت حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق رضؓ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ علیہم کا مسلک تھی۔ اسی طریقت پر حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ عامل تھے۔ اس کی تعلیم حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ نے دی تھی۔ اسی پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عمل کیا۔ اسی پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ عمل کرتے رہے۔ یہی طریقت حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ورد حیات تھی۔ اور اسی کی دعوت حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنی زبان اور قلم سے دیتے رہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ملفوظات موسوم بہ "دلیل العارفین" اول سے آخر تک نماز و عبادات کی تاکید اور اتباع سنت کے فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں وضو اور اسی قسم کی دوسری عبادتوں کی سنتوں کی پابندی پر اس قدر زور دیا گیا ہے۔ کہ فی زمانہ فرائض کی پابندی اس اہتمام سے مشکل نظر آتی ہے۔ اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین ایک ٹھیٹھ فقیہہ اور ایک عالم با شرع کی فقہی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ یہی عالم حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات فوائد الفواد کا ہے۔ ان میں ہمیشہ طاعت و عبادات میں مشغول رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حضرت خود اسی سال کی عمر میں بھی پانچ وقت کی نماز با جماعت کا اہتمام کرتے تھے۔ اور جماعت خانے کے بالائی حصے سے نماز کیلئے نیچے تشریف لاتے تھے۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات شروع سے آخر تک اسی پر زور دیتے ہیں۔ کہ اہل طریقت کو اپنے عقائد اور اپنے اعمال میں ہمیشہ کتاب و سنت ہی کو اپنا مشعل راہ بنانا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ صحیح طریقت وہ ہے۔ جسے علمائے اہل سنت نے کتاب و سنت کے حوالے سے مرتب کیا ہے۔ اور کبھی کوئی کیفیت کتاب و سنت کے خلاف کشف و الہام کے ذریعے محسوس ہو تو اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے آپ نے فرمایا کہ شریعت کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے۔ اس کی صورت وہ ہے جو علماء بیان کرتے ہیں اور حقیقت وہ ہے جو اہل طریقت کا شعار ہے۔ جو کچھ ہم فقیروں پر لازم ہے وہ عجز و انکسار ہے۔ تضرع و ابتہال وظائف عبودیت کا ادا کرنا، حدود شرع کی حفاظت کرنا اور سنت کا

اختیار کرتا ہے۔ شریعت پر اسی طرح عمل کرنے کی دعوت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصانیف "القول الجمیل۔ حجۃ اللہ البالغہ میں دیا۔

کتاب اللمع کے مصنف شیخ ابو النصر سراج جو علوم ظاہری و باطنی سے موصوف تھے۔ اور تصوف وطریقت میں چوتھی صدی ہجری کے امام برحق تھے اور اپنی اس کتاب میں اہل طریقت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے تمام مومنین سے بلند و برتر مرتبہ ان کا رکھا ہے جو اولو العلم اور قائمین بالقسط ہیں۔ اور ملائکہ کے بعد انہی کی شہادت پیش کی ہے۔ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ۔ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علماء کو انبیاء کا جانشین ارشاد فرمایا ہے۔ سو یہ القاب میرے خیال میں ان لوگوں کے حق میں وارد ہوتے ہیں۔ جو کتاب اللہ کو سررشتہ مضبوط تھامنے والے اور رسول اللہ کی متابعت کے پورے کوشاں اور صحابہ اور تابعین کے نقش قدم پر چلنے والے اور اللہ کے اولیا متقین و صالحین کی راہ اختیار کرنے والے ہیں۔ ایسے اشخاص کو تین طبقوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ ارباب حدیث کا، دوسرا فقہا کا اور تیسرا اہل طریقت کا۔ بس یہی طبقات اولو العلم اور قائم بالقسط کہنے جانے کے مستحق ہیں۔

شیخ سراجؒ اہل طریقت کے طرز عمل کا اس طرح تجزیہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ کہ بہت سے امور تو اہل طریقت، محدثین اور فقہا میں مشترک ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی دونوں اپنا شعار سمجھتے ہیں۔ لیکن اس اشتراک کے بعد اہل طریقت انواع عبادات، حقائق طاعات اور اخلاق جمیلہ سے حق درجات عالیہ اور منازل رفیعہ کے طے کرنے لگتے ہیں۔ وہاں تک علماء ظاہری فقہا اور اصحاب [illegible] رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔ اہل طریقت کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ ہی پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کا [illegible] مقصود تمام تر اللہ ہی ہوتا ہے۔ ماسوا اور لایعنی مشغلوں سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ جب اس طرح ان کی توحید خالص ہو جاتی ہے۔ اور وہ غیر اللہ سے کسی طرح بھی اپنا دل نہیں اٹکاتے اور صرف اللہ سے ہی اپنا لو لگاتے ہیں تو ان کی زندگی کا شیوہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ قناعت کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں۔ قلیل کو کثیر پر ترجیح دیتے ہیں۔ غذا، لباس اور ہر قسم کا سامان دنیوی سے صرف ضرورت کے مطابق اختیار کرتے ہیں۔ بجائے تونگری کے تنگدستی، بجائے سیری کے گرسنگی، بجائے افراط کے قلت، بجائے جاہ و ترفع کے تواضع و انکسار، ہر چھوٹے بڑے کے مقابلے میں وہ اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ جل شانہ نے اپنے کلام پاک میں صادقین، قانتین، خاشعین، عابدین ذاکرین اور صابرین جیسے خطابات سے نوازا ہے۔ حضور سرور کائنات نے بھی فرمایا ہے۔

"میری امت میں ایسے لوگ بھی ہونگے۔ جو مکالمہ الہی اور گفتگوئے الہی سے سرفراز ہوں گے۔ اور عمرؓ بھی انہیں میں سے ہوں گے۔"

ایک دوسری حدیث میں فرمایا ہے۔ "میری امت میں ایک ایسا شخص بھی ہوگا۔ جس کی شفاعت سے بہت کثرت سے لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے اور اس کا نام اویس قرنی ہوگا۔

شیخ سراجؒ نے علم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ علم ظاہری اور علم باطنی۔ جس علم کا تعلق زبان اور اعضاء سے ہے وہ علم ظاہری ہوا۔ اور اس کو علم شریعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا علم یا طلاق و فرائض قصاص کا علم۔ جب اس علم کا اثر ظاہر سے گذر کر باطن تک پہنچتا ہے تو اس کو علم باطن یا علم طریقت کہتے ہیں۔ علم شریعت میں اگر تقسیم عبادات اور احکامات کی تھی تو علم طریقت میں انہیں مقامات اور احوال کہا جائے گا۔ مثلاً تصدیق اخلاص۔ صبر، تقویٰ، توکل وغیرہ اسی معنی میں ظاہری اور باطنی کی تقسیم کا ثبوت کلام پاک سے بھی ملتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے سورۃ لقمان میں فرمایا۔ "اَصْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً" "اس نے اپنی نعمتیں تمہارے اوپر پوری کیں۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ غرضیکہ موجوداتِ عالم میں ہر شئے کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی۔ یہاں تک کہ قرآنِ پاک کا بھی ایک ظاہری پہلو اور ایک باطنی۔ اسی طرح حدیث مبارک کا بھی ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی۔ قرآن و حدیث کے اس باطنی پہلو کو طریقت کا نام دیا گیا۔ جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے کوئی علیحدہ پہلو نہیں۔ بلکہ ان کا مغز ہے۔ اکابرینِ طریقت کے اعمال و اقوال اسی کی تائید کرتے ہیں۔ حضرت جنید لبغدادیؒ فرماتے ہیں۔ "ہمارا یہ سارا علم احادیث نبویؐ کا نچوڑ ہے اور قرآنِ پاک کی سورۂ نور میں اتباعِ سنت کا حکم اس طرح آیا ہے۔ "وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا" حضرت ابو عثمان سعید الحیریؒ کا قول ہے۔ کہ جو شخص سنت نبوی کو قولاً و فعلاً اپنے اوپر حاکم بنالے اس کی بات ہمیشہ حکمت سے لبریز رہے گی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اللہ پاک سے دعا کرنا چاہی کہ بھوک اور خواہشِ نفسانی کی آفت سے محفوظ رہیں۔ لیکن خیال آیا کہ حضور سرورِ کائناتؐ نے ایسی دعا اپنے لئے کبھی نہیں کی تو میں کیونکر کر سکتا ہوں۔ اس خیال سے انہوں نے یہ دعا نہ مانگی۔ اس احترامِ رسالت کا صلہ انہیں یہ ملا کہ وہ خواہشِ نفسانی سے ہمیشہ کے لئے پاک رہے۔ حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ نزع کا وقت تھا، گویائی جواب دے چکی تھی۔ ایک خادم وضو کرا رہا تھا۔ ڈاڑھی میں خلال کرانا بھول گیا۔ حضرت شبلیؒ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ڈاڑھی میں خلال کرائی۔ اور اسطرح سنت نبوی کا کوئی حصہ بھی اپنے عمل سے خارج نہ ہونے دیا۔

طریقت کے مسائل کا استنباط بھی شریعت کے مسائل کی طرح کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہی سے کیا جاتا ہے۔ بقول ابو النصر سراجؒ طریقت کے مسائل کے استنباط کا حق ارباب فہم کو پہنچتا ہے۔ جو ظاہر اور باطن میں ہر طرح کتاب و سنت کے متبع ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب عرصہ تک اپنے علم کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں تو اللہ پاک انہیں وہ علم بھی عطا کر دیتا ہے جو ان کے نفوس میں تزکیہ اور قلوب میں جلا پیدا کرتا ہے اور کثرتِ معاصی و شہوات حبِ جاہ، حرص و طمع اور خود پسندی وغیرہ ہے۔ جو زنگ دل پر جم جاتا ہے وہ دھل جاتا ہے اس وقت ان پر اسرارِ غیب منکشف ہو جاتے ہیں اور ان کی زبانیں حقائق عالیہ کی ترجمانی کرنے لگتی ہیں۔

حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ پانچویں صدی کے بزرگ ہیں۔ آپ اپنی تصنیف "کشف المحجوب" میں جو فارسی زبان میں علم طریقت کی قدیم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ شریعت اور طریقت کی تشریح

اس طرح کرتے ہیں۔" علم ظاہر سے مراد معاملات ہیں اور علم باطن سے تصحیح نیت"۔ ان میں سے ایک کا وجود بغیر دوسرے کے محال ہے۔ ظاہر بغیر امتزاجِ باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر شمول ظاہر زندقہ ہے۔ شریعت کا ظاہر بلا باطن نقص ہے اور باطن بلا ظاہر ہوس ہے۔ اس طرح علم طریقت کے تین رکن ہیں۔ ایک علم ذاتِ خداوندی، دوسرے علم صفات و احکاماتِ خداوندی، تیسرے علم افعال و حکمت افعالِ خداوندی۔ علم شریعت کے بھی اسی طرح تین رکن ہیں۔ ایک کتاب اللہ، دوسرے سنت اور تیسرے اجماعِ صحابہ۔

حضرت داتا گنج بخش علم شریعت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے محمد بن فضل البلخیؒ کا قول نقل کرتے ہیں۔ جن کے مطابق علم کی تین قسمیں ہیں۔ ایک علم من اللہ، دوسرے علم مع اللہ، تیسرے علم اللہ علم باللہ معرفت ہے۔ جس کے ذریعے انبیأ اور اولیأ معرفتِ خداوندی حاصل کرتے ہیں۔ علم من اللہ شریعت ہے۔ علم مع اللہ مقامات طریقت کا علم ہے۔ معرفت بغیر علم شریعت کے درست نہیں ہو سکتی اور شریعت پر عمل مقاماتِ طریقت کے بغیر پورا نہ ہونے پائے گا۔ جسے علم معرفت نہیں اس کے قلب پر جہل کی موت طاری ہے۔

داتا صاحبؒ ایک اور مقام پر شریعت اور طریقت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔ "وہ شریعت اور طریقت کے باہمی تعلق کی مثال روح و جسم کے اتصال کی ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے۔ دونوں متصل ہیں۔ جب روح نکل گئی تو جسم مردہ ہو گیا۔ دونوں کی اہمیت اور قدر اسی وقت تک ہے جب تک دونوں ایک دوسرے کے شریک اور رفیق ہیں۔ اسی طرح شریعت بغیر مغز حقیقت کے ایک ریاکاری ہے اور حقیقت بغیر امتزاجِ شریعت منافقت ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا" وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ انہیں ہم اپنی راہ دکھا کر رہیں گے۔ اس جدوجہد اور مجاہدے کا نام شریعت ہے اور جو ہدایت اس پر مرتب ہوتی ہے اس کا نام حقیقت ہے۔ شریعت کا ماحاصل احکامِ ظاہری کی تعمیل ہے اور حقیقت کا خلاصہ احوالِ باطن کا اپنے اوپر طاری کرنا۔ شریعت بندے کے اختیار کی چیز ہے۔ اور حقیقت عطیۂ الٰہی ہے"۔

حضرات اپنے معروضات کا اختتام میں اکبر الٰہ آبادی کے چند اشعار پر کر رہا ہوں۔ جو شاعر ہونے کے علاوہ حکیم و عارف بھی تھے۔

شریعت در محفل مصطفیٰ — طریقت عروجِ دلِ مصطفیٰ
عبادت سے عزت شریعت میں ہے — محبت کی لذت طریقت میں ہے
شریعت میں ہے صورت فتح بدر — طریقت میں ہے معنیٔ شق صدر
شریعت میں ہے فیل و قال حبیب — طریقت میں ہے حسن و جمال حبیب
نبوت کے اندر ہی ہیں دونوں لنگ — عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

مولانا مفتی غلام قادر صاحب
صدر مدرس مدرسہ فاضل خیر پور

اولیائے کرام — اور — تبلیغ اسلام

تبلیغ اہم فریضہ ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی پرزور تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" اس آیت میں حکم فرمایا گیا ہے کہ امت میں سے ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری ہے، جو لوگوں کو تبلیغ کرے۔ بھلائی کے کاموں کی دعوت دے۔ ایک دوسری آیت "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" میں بھی فریضۂ تبلیغ کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ اس آیت میں اس امت کو سب سے بہترین امت قرار دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی علت کی طرف بھی ارشاد فرمایا ہے کہ تم بہترین امت اس لئے ہو کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایمان سے بھی پہلے ذکر فرمایا۔ حالانکہ ایمان تمام اعمال کی اصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان میں تو امم سابقہ بھی شریک تھیں۔ یہ خاص خصوصیت جس کی وجہ سے امتِ محمدیہ کو تمام انبیاء علیہم السلام کے متبعین سے برتری حاصل ہے۔ وہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جو اس امت کا تمغۂ امتیاز ہے۔ ایک اور آیت میں تبلیغ کی فضیلت کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ "وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ"۔ یعنی اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے۔ جو خدا کیطرف بلائے اور خود نیک عمل کرے۔ اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کسی کو بلائے وہ اس بشارت اور تعریف کا مستحق ہے۔ خواہ کسی طریق سے بلائے۔ مثلاً علماء لوگوں کو اپنے مواعظ سے دعوت دیتے ہیں۔ متکلمین اسلام اپنے دلائل سے، مجاہدین اسلام اپنی تلوار سے، مؤذنین آذان سے، اولیائے کرام اپنی کرامات اور اخلاق سے الغرض جو بھی کسی شخص کو دعوت الی الخیر کرے وہ اس میں داخل ہے۔ خواہ اعمال ظاہرہ کی طرف بلائے یا اعمال باطنہ کی طرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کی تاکید کے طور پر فرمایا۔ "مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ" یعنی جو شخص کسی ناجائز امر کو ہوتا ہوا دیکھے اس کو ہاتھ سے بند کرے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو۔ اگر اتنی طاقت نہ ہو تو زبان سے اس پر نکیر کرے اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا بہت ہی کم درجہ ہے۔ نیز سرکار دو عالم کا ارشاد ہے: "بلغوا عنی ولو آیۃ" میری باتیں لوگوں تک پہنچاؤ۔ خواہ تمہاری معلومات میں ایک ہی حکم کیوں نہ ہو۔ مذکورہ بالا آیات واحادیث سے تبلیغ کی اہمیت اور فضیلت عیاں ہے۔ تبلیغ کا فریضہ اگرچہ اس امت کے مختلف طبقوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ادا کیا ہے۔ بہت سے نیک دل مسلمان سلاطین اور امراء نے بھی اس فریضہ کو انجام دیا۔ علمائے متکلمین اسلام، درس وتدریس دلائل وبراہین

اور تقاریر کے ذریعے اس فریضہ کو انجام دیتے رہے۔ مگر تبلیغِ اسلام میں سب سے زیادہ موثر اور نمایاں طریقہ تبلیغ اولیاءُ اللہ کا ہے کہ ان کے فیضانِ صحبت لوگوں کے دلوں کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ علماء اپنی تقریروں میں سیکڑوں اور ہزاروں کو خطاب کرتے ہیں۔ ان کی بات عام طور پر صرف سماع تک محدود رہتی ہے۔ مگر اولیاء اللہ کی بات "از دلِ خیزد بر دلِ ریزد" کا مصداق ہوتی ہے۔

شیخ المشائخ پیرِ پیران حضرت غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلسِ وعظ میں لوگوں پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ اور سامعین کے دل اس سے منور ہو جاتے تھے۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ اجمیری ہندوستان میں جب آئے تھے۔ تو تنہا تھے۔ اور جب اس عالمِ فنا سے عالمِ بقا کی طرف رحلت فرما ہوئے۔ تو نوے لاکھ فیض یافتہ انسانوں کی جماعت چھوڑ گئے۔ آپ کے فیض یافتہ لوگوں میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے حضرات بھی ملتے ہیں۔ حضرت خواجہ اجمیری نے جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو خرقۂ خلافت عنایت فرمایا اور قرآن کریم، جانماز اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مبارک عنایت فرمائے تو یہ بھی فرمایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی امانت ہے۔ جو خواجگانِ چشت کے ذریعے ہم تک پہنچی تھی تم اس کی لاج رکھنا۔ تاکہ کل قیامت کے دن اپنے مشائخ کے روبرو مجھے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ آپ نے رخصت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ انسان کی عظمت چار چیزوں میں ہے۔ اول یہ کہ فقیری میں تونگری کرے۔ دوم بھوک میں سیر نظر آئے۔ سوم یہ کہ غم و تکلیف میں مسرور رہے۔ چہارم یہ کہ دشمن سے بھی دوستی ظاہر کرے۔ پھر فرمایا جہاں جانا دل آزاری نہ کرنا اور جہاں رہنا مردانہ وار رہنا۔ دیکھئے کس قدر موثر پیرایہ میں تبلیغ کا فریضہ انجام دیا جا رہا ہے۔ پھر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا دہلی اور اس کے اطراف میں کس قدر فیض پھیلا۔ یہی حال تمام اکابر اولیاءاللہ کا ہے کہ ان کے فیضانِ صحبت اور تبلیغ سے دنیا کی کایا پلٹ جاتی رہی۔ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق اگرچہ اولیاء اللہ کے تربیت کے طریقے مختلف رہے ہیں۔ مگر سب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی ایصال الی اللہ۔ حضرت شیخ بہاؤالدین ابو محمد ذکریا ملتانیؒ جب بغداد سے ملتان آئے تو ملتان کے صوفیاء حضرات نے آپ کے پاس لبریز دودھ کا ایک پیالہ روانہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ملتان اولیاء کرام سے پُر ہے۔ اب کسی دوسرے کی گنجائش نہیں۔ حضرت شیخ نے صوفیا کے اس اشارہ سے واقف ہو کر دودھ کے اس پیالہ پر گلاب کا ایک پھول کھڑا کر کے دودھ کا بھرا ہوا پیالہ واپس لوٹا دیا۔ جسمیں اس بات کی طرف اشارہ تھا۔ کہ جیسے اس پھول کے وجود سے اس دودھ کے بھرے ہوئے پیالہ کو کوئی نقصان نہیں۔ اسی طرح ہمارے وجود سے بھی آپ حضرات کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اکابر صوفیاء آپ کی اس ادائیگی کے حسنِ لطافت پر متحیر ہوئے۔ آپ کی کرامات کے قائل اور آپ کے مطیع ہوئے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا کا کس قدر فیض پھیلا۔ آپ نے لوگوں کو کفر سے ایمان کی، گنہگاری سے اطاعت کی اور نفسانیت سے روحانیت کی راہ دکھائی حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کی جنکی کرامتیں اور ریاضتیں بہت ہی مشہور ہیں۔ ان کی تبلیغ کا نرالا انداز تھا۔ آپ کا ہمسایہ ایک یہودی تھا۔ وہ یہودی روزانہ اپنے گھر کی تمام پلیدی آپ کے گھر میں پھینک دیتا تھا۔ ایک عرصہ تک وہ

ایسا ہی کرتا رہا۔ آپ نے اس کا کسی ذکر نہ کیا۔ ایک دن وہ یہودی آپ کے پاس آیا کہنے لگا۔ کہ اے مالک! انہیں میرے اس کوڑا کرکٹ اور گندگی سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ آپ نے فرمایا "کہ میں ایک تغار اور ایک جھاڑو رکھ چھوڑا ہے۔ میں روزانہ صاف کرکے دھو ڈالتا ہوں"۔ یہودی نے کہا کہ "آپ غصہ کو کیسے ضبط کرتے ہیں؟" فرمایا اس لئے کہ ہمیں وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ کا حکم ہے۔ یہودی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ یہ کیسا اچھا دین ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا دوست دشمن کی تکلیف برداشت کرتا ہے اور اس پہ شکایت نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر وہ مسلمان ہوگیا۔

ایک دفعہ حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ کہیں جا رہے تھے۔ کہ ایک شخص نہایت حسین و جمیل ایک مکان کی تعمیر کیلئے کاریگروں کو ہدایت دے رہا تھا۔ آپ کی اس شخص پر نظر پڑی۔ فرمایا کس قدر حسین چہرہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ دوزخ کی آگ میں نہ جلے۔ آپ نے اسے فرمایا کہ اس مکان پر کس قدر روپیہ لگانے کا خیال ہے۔ اس نے کہا ایک لاکھ درہم۔ آپ نے فرمایا۔ کیوں نہیں یہ لاکھ درہم میرے حوالے کرتا کہ اس کے بدلے میں بہشت کا ایک عمدہ محل جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی اور گارا کستوری کا ہو۔ تجھے ملے۔ اس نے ایک رات سوچنے کی مہلت مانگی۔ دوسرے روز پھر آپ تشریف لے گئے۔ وہ شخص انتظار میں تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کل کی بات کے متعلق تیرا کیا خیال ہے۔ اس نے کہا کہ کیا آپ ضمانت دیتے ہیں؟ آپ تیار ہوگئے۔ آپ نے ایک پرچہ بطور ضمانت نامہ تحریر فرما دیا کہ میں مالک بن دینار کی طرف سے اس بات کی ضمانت ہے۔ کہ اس شخص کو بہشت میں ایسا عمدہ محل ملے گا۔ اس شخص نے پرچہ لیا اور رقم حضرت مالکؒ کے حوالے کر دی۔ حضرت نے شام تک یہ تمام رقم خیرات کر دی۔ اپنے لئے ایک درہم بھی نہ رکھا۔ وہ شخص اسی دن سے نہایت عابدانہ و زاہدانہ زندگی گذارنے لگا۔ چند دن کے بعد اس کا انتقال ہوا اس کی وصیت کے مطابق وہ پرچہ اس کے کفن میں رکھا گیا۔ اور اسے دفن کر دیا گیا۔ اتفاق سے حضرت مالکؒ اس محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ تو محراب میں آپ نے ایک پرچہ دیکھا۔ اٹھوایا اور پڑھا۔ یہ وہی پرچہ تھا۔ جو حضرت مالکؒ نے بطور ضمانت دیا تھا۔ اس کی دوسری طرف سیاہی کے بغیر لکھا ہوا تھا۔ کہ یہ مالک بن دینار کی ضمانت کا برائت نامہ ہے۔ ہم نے اس کو وہ سب کچھ دیدیا جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اور اس سے کئی گنا زیادہ۔ یہی حضرت مالک بن دینار حج کرنے گئے۔ جب لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ شروع ہوا تو آپ بیہوش ہوگئے۔ اور گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ "میں اس بات سے خوفزدہ ہوگیا تھا۔ کہ کہیں مجھے لا لبیک کا جواب نہ ملے۔ جب آپ نماز میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پڑھتے تو زار و قطار روتے اور فرماتے کہ ہم زبان سے کہتے ہیں کہ ہم تیری پرستش کرتے ہیں۔ مگر نفس پرستی میں مشغول ہیں۔ اور زبان سے کہتے ہیں کہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ مگر لوگوں کے دروازوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ دیکھئے کتنا مؤثر انداز تبلیغ ہے۔ آیئے

اب ہم اپنے شہرہ ولیٔ کامل محبوب الٰہی رئیس العارفین سلطان الزاہدین شیخ الاسلام والمسلمین جامع العلوم و المعارف حضرت خواجہ خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ کے طریقۂ تبلیغ پر نگاہ کریں۔ کہ آپ کے مواعظ و برکات سے ایک جہان فیض یاب ہوا۔ آپ کی عادت مبارکہ تھی۔ کہ آپ کسی کو لا تفعل اور لا تفعل صریح نہ فرماتے۔ بلکہ اشارات سے تلقین

CamScanner

فرماتے۔ ؎ بہ بندِ فعلی خلق را جذّاب تو

عام طور اپنے واعظ میں آیات و احادیث کا ذکر کم فرماتے تھے۔ آپ عموماً قصص و حکایات اور اشعار کے ضمن میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ تاکہ اگر کوئی شخص بسبب جہل انکار کر دے تو کافر نہ ہو۔ آپ تہجد کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ؎

سحر برخیز و ذکر بے ریا کن | بداں درگاہ خود را آشنا کن
اگر گوئی کہ ہستم درویش حالم | نظر بر خاندانِ مصطفےٰ کن
وگر گوئی کہ برمن ظلم رفت است | نظر بر کشتگان کربلا کن

آپ لوگوں کی خواہش کے پورا نہ ہونے پر مغموم رہنے سے روکتے تھے۔ اور ایسے لوگوں کو ان الفاظ میں تلقین فرماتے تھے۔ ؎

کارہا بر خواہش خود خواستن کارِ خدا است
بندہ باشی و خدائی کردی تو اے نادان چرا است

آپ تلقین فرماتے۔ کہ آدمی کو ہر وقت اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر بے کار رہے گا۔ تو نفس اس کو برے اشتغال میں مشغول کر دے گا۔ اس غرض کے لئے آپ فرمایا کرتے تھے۔ ع

بے کار مباش کچھ کیا کر

آپ سراپا تواضع تھے۔ اور اپنے متوسلین کو تواضع اور انکساری کا درس دینے کے لئے فرمایا کرتے تھے کہ "میری مثال حجرِ اسود کی ہے۔ کہ لوگ اس کو بوسہ دیتے ہیں اور وہ خود سیاہ ہے۔ دیکھئے کس قدر کمال تواضع ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ تین شخص عجیب ہیں۔ ایک اندھا کہ وہ اندھا ہونے کے باوجود باریک چیز دیکھتا ہے۔ دوسرا بہرہ کہ آہستہ آواز بھی سن لیتا ہے۔ تیسرا ننگا جس کو اپنے لباس کی چوری کا ڈر ہے۔ اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ اول وہ شخص ہے۔ جو اپنے عیبوں کو نہیں دیکھتا اس لحاظ سے وہ اندھا ہوا اور دوسروں کے باریک عیب بھی اس کو نظر آ جاتے ہیں۔ دوسرا وہ شخص ہے جو اپنی موت کی خبر نہیں رکھتا لیکن وہ دنیا بھر کی خبریں سنتا رہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جسے اپنے لئے کفن ملنے کا بھی یقین نہیں ہے جو اسکا لباس ہوگا۔ مگر یہ شخص کپڑوں کے چرائے جانے سے ڈرتا رہتا ہے۔ آپ خود حلیم الطبع تھے اور اپنے شاگردوں اور متوسلین کو اپنے عمل سے حلم کی تلقین فرماتے۔ اس بارہ میں آپ فرمایا کرتے تھے ؎

ہر کہ ما را رنج دارد راحتش بسیار باد | ہر کہ ما را دوست نبود ایزد او را یار باد
ہر کہ اندر راہ من خارِ نہد از دشمنی | ہر گلے کز باغ عمر بشگفتہ بے خار باد

یہ حضرات اولیاء اللہ کے تبلیغ کے چند نمونے تھے۔ بہر حال یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرات اولیائے کرام کی تبلیغ سے مخلوقِ خدا کو جس قدر حقیقی اور پائیدار فیض پہنچا۔ اس قدر کسی اور طبقہ کو حاصل نہ تھا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط۔

مسعود حسن شہاب دہلوی

بہاولپور کی روحانی ترقی میں خانوادۂ چشتیہ کا حصہ

خواجہ خدا بخشؒ اسی باغ کے گل سر سبد تھے

قبلہ عالم خواجہ نور محمد مہارویؒ کی آپ پر خاص نظرِ کرم تھی

بہاول پور کی روحانی ترقی میں خانوادۂ چشتیہ کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ یوں تو اس خانوادے کے بزرگوں کی دینی اور روحانی خدمات پورے برصغیر پر محیط رہی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ برصغیر میں اسلام کے فروغ کا سہرا انہیں بزرگوں کے سر ہے تو کوئی بے جا نہ ہوگا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت خواجہ علاؤالدین صابر کلیریؒ ان جلیل القدر چشتی بزرگوں میں سے ہیں۔ جن کی جلالتِ علمی اور کمالاتِ روحانی کے آگے بڑے بڑے باجبروت اور صاحبِ سطوت سلاطین سرِ نیاز خم کرتے تھے۔ انہوں نے طریقت کا جو چراغ روشن کیا تھا۔ اس کی ضیاء باریوں سے ہندوستان کا چپہ چپہ منور ہوا۔ اور لاکھوں بندگانِ خدا نے ان کی تعلیمات اور روحانی فیوض کی بدولت راہِ مستقیم اختیار کی۔

بہاول پور بھی ان خوش نصیب خطوں میں سے ہے۔ جسے اس خانوادے کے بزرگوں سے براہ راست استفادے کا موقع ملا۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور ان کی اولاد کی اس خطے کے لوگوں پر خصوصی نظرِ عنایت رہی۔ آج ضلع بہاولنگر میں جگہ جگہ جو قدیمی مزارات نظر آتے ہیں۔ وہ یا تو بابا صاحب کی اولاد کے یا ان کے متوسلین کے ہیں۔ چنانچہ چشتیاں میں حضرت تاج الدینؒ کا مزار جو اس نواح کے قدیم ترین مزاروں میں شمار ہوتا ہے۔ چشتی بزرگوں کی اس علاقے سے دلچسپی کا بیّن ثبوت ہے۔ حضرت شیخ تاج الدین تاج سرورؒ حضرت بابا فرالدین گنج شکرؒ کے پوتے تھے۔ جن کا حلقۂ اثر بیکانیر اور جیسلمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ بعد کے ادوار میں ان بزرگوں نے ہندوستان کے دوسرے حصوں کیطرف زیادہ توجہ دی۔ جس کی وجہ سے یہاں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ جسے دوسرے سلاسلِ تصوف کے بزرگوں نے جن میں سہروردی بزرگان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں پورا کرنے کی کوشش کی۔ تقریباً چار سو سال کے طویل عرصہ تک، یہ علاقہ انہی سہروردی بزرگوں کے تصرف میں رہا۔ آخر کار بارھویں صدی ہجری یہاں دوبارہ سلسلہ چشتیہ کے فروغ کی خبر لائی۔ اور حضرت قبلہ عالم خواجہ نور محمد مہارویؒ کی شخصیت منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئی۔ جنہوں نے چار سو سالہ پرانی روایات کو از سرِ نو زندہ کیا اور اپنے چشمۂ فیض سے نہ صرف اس سرزمین بلکہ پورے پنجاب کو سیراب کیا۔ آپ کی تربیت سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی شاخ فخریہ کے موسس محب نبی حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں دہلویؒ نے کی تھی اور انہیں کے حکم پر آپ نے مہار شریف میں تلقین و ارشاد کی مسند آراستہ کی تھی۔ مرشدِ روحانی نے فرمایا تھا کہ "آپ کے دامن سے ایک رئیس متوسل ہوگا۔

اس کے لئے دعائے خیر کرتے رہنا۔ کیونکہ ایک والیٔ ملک کی صحت و سلامتی سے اس کی تمام رعایا کی جو مخلوقِ خدا ہے، بہبودی وابستہ ہوتی ہے۔" چنانچہ نواب بہاول خاں ثانی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ اس زمانے میں ریاست اندرونی و بیرونی خطرات سے دوچار تھی۔ پنجاب میں جو سکھا شاہی کا بازار گرم تھا۔ اس کے اثرات ریاست میں بھی پہنچ رہے تھے۔ رنجیت سنگھ بہانے بہانے بنا بنا کر ریاست کو ہڑپ کرنے کی فکر میں تھا۔ نواب بہاول خاں نے اس موقع پر جہاں اپنی فہم و فراست اور شجاعت و بہادری سے کام لیا وہاں حضرت قبلہ عالمؒ کی دعائیں بھی کام آئیں اور ریاست تمام خطرات سے محفوظ رہی۔

ایک مرتبہ حضرت فخرِ جہاں دہلویؒ کی محفل میں کسی نے یہ ذکر چھیڑا کہ ملتان میں حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ کی عظمت کا اب تک یہ حال ہے کہ کسی دوسرے ولی کا وہاں تصرف کام نہیں آتا۔ اور کوئی شخص وہاں کسی دوسرے سلسلہ میں بیعت نہیں کرتا۔ یہ سن کر حضرت فخرِ جہاں مراقبے میں گئے۔ اور پھر فرمایا۔" میاں نور محمدؒ ولایت ملتان میں بہاؤالحق صاحب کی تھی۔ لیکن اب ملتان ہمارے حوالے ہو گیا ہے، لازم ہے کہ کسی اپنے مریدوں میں سے وہاں بھیجو کہ وہ عین خانقاہ حضرت بہاؤالدین کے سامنے لوگوں کو بیعت کرے اور تصرف اپنا کرے۔ اس ارشاد کے مطابق حضرت قبلہ عالمؒ نے اپنے مریدِ خاص حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کو ہدایت کی کہ وہ خانقاہ حضرت بہاؤالحق میں بیٹھ کر بیعت کا سلسلہ شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے سہروردی خانقاہ میں جس شخص کو داخلِ سلسلۂ چشتیہ کیا وہ حضرت خواجہ خدا بخش خیرپوریؒ تھے۔ جن سے اس علاقے میں سلسلۂ چشتیہ کی تجدید ہوئی۔ اور روحانی و دینی تعلیم کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

حضرت خواجہ خدا بخشؒ جنہوں نے حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی سے خلافت حاصل کی تھی، حضرت قبلہ عالمؒ کے بھی بڑے منظورِ نظر تھے۔ حضرت حافظ جمال اللہ فرمایا کرتے تھے کہ خواجہ خدا بخشؒ کو میرے ساتھ تو فقط بیعت کا تعلق ہے۔ ان کو جو بلند مرتبے حاصل ہوئے ہیں خود حضرت قبلہ عالم سے ملے ہیں۔

سکھ گردی کے زمانے میں آپ ملتان سے ترکِ سکونت کر کے خیرپور تشریف لے آئے۔ یہاں نواب بہاول پور نے آپ کی پذیرائی کی اور آپ کے لنگر کا خرچ اپنے ذمہ لیا۔ آپ کی آمد سے یہ علاقہ رشکِ گلزار بن گیا۔ اور طالبانِ حق جوق در جوق یہاں آنے لگے۔ آپ کی تمام عمر درس و تدریس میں صرف ہوئی۔ آپ کی علمی یادگار آپ کی تصنیف "توفیقیہ" ہے۔ جس میں احکام شریعت اور آدابِ طریقت کے علاوہ وحدت الوجود کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کا وصال ۱۲۵۱ھ میں ہوا۔ مزار مبارک خیرپور میں مرجعِ خلائق ہے۔

ضلع بہاولنگر کی طرح ضلع رحیم یار خاں میں بھی چشتی بزرگوں کا فیض جاری رہا ہے۔ یہاں خان بیلہ، چاچڑاں، شندانی اور گڑھی اختیار خاں خاص طور پر اس سلسلے کے بزرگوں کے مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس علاقے میں جس بزرگ کی وجہ سے چشتیہ سلسلے نے فروغ پایا وہ حضرت خواجہ محمد عاقلؒ تھے۔ آپ اور آپ کے خاندان کے بزرگوں کے مدفن تو کوٹ مٹھن میں ہیں۔ لیکن ان کا مسکن بہاولپور کا مشہور قصبہ چاچڑاں

رہا ہے۔

حضرت خواجہ عاقل محمدؒ کو حضرت قبلہ عالم خواجہ نور محمدؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ بقول تکملہ سیر الاولیاء حدیث و فقہ میں آپ کا شرق و غرب میں کوئی ثانی نہ تھا۔ آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ قائم رکھا تھا۔ اور طلباء کو خود بھی درس دیا کرتے تھے۔ آپ کے تربیت یافتگان میں مولانا خدابخش، خواجہ سلطان محمود اور خواجہ حکیم گل محمد احمد پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تھا آپ کے روحانی کمالات اور فیضِ جاریہ کا ایک واضح ثبوت ہے کہ آپ کے خاندان میں یکے بعد دیگرے ایسی ہستیوں نے جنم لیا جن سے روحانیت کا چمن تا دیر لہلہاتا رہا

حضرت خواجہ عاقل محمدؒ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت میاں احمد علیؒ مسندِ سجادگی پر بیٹھے آپ بھی بڑے متبحر عالم تھے۔ اور خواجہ سلیمان تونسوی جیسے بزرگ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ آپ کو شرفِ بیعت حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ سے حاصل تھا۔ آپ نے ۱۲ شعبان المعظم ۱۲۳۱ھ کو رحلت فرمائی۔ اور آپ کے صاحبزادے حضرت خواجہ خدابخشؒ جو آپ کے دادا حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کے خلیفہ تھے زینت دہ سجادہ ہوئے۔ آپ نے مستقل طور پر چاچڑاں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ جس کے بعد اس بستی کو چار چاند لگ گئے۔ کسی نے چاچڑاں کی علمی و روحانی برکات کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔

فقر گر خواہی برو در چاچڑاں　　ہست محکم فیضِ حق سرکارِ ما

حضرت خواجہ خدابخشؒ کو اللہ نے دو صاحبزادے عطا کئے تھے۔ ایک خواجہ غلام فخرالدین اور حضرت خواجہ غلام فرید الدین۔ یہ دونوں حضرات فخرِ خاندان ثابت ہوئے۔ خاص طور پر حضرت خواجہ غلام فرید نے روحانی تعلیمات کے ساتھ صوفیانہ شاعری میں جو کمال پیدا کیا اس کے اثرات آج تک قائم ہیں۔

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ کے دوسرے پوتے خواجہ تاج محمود کے صاحبزادے خواجہ غوث بخش نیدانی ہیں۔ رہائش پذیر تھے۔ اس قصبے میں اور اس کے گرد و نواح میں آپ اور آپ کی اولاد نے روحانی تعلیمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ خان بیلہ میں حضرت خواجہ محمد عاقل کے خلیفہ حضرت سلطان محمود نے سلوک و طریقت کی شمع روشن رکھی اور ہزاروں کی تربیت کا فرض انجام دیا۔ گڑھی اختیار خان میں حضرت خواجہ یار محمد فریدیؒ مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز تھے۔ آپ حضرت خواجہ غلام فرید کے تربیت یافتہ تھے اور چودھویں صدی ہجری کے ان بزرگوں میں سے تھے جن سے صحیح معنی میں تصوف و طریقت کا بھرم قائم تھا۔

بہاولنگر اور رحیم یار خان کی طرح ضلع بہاولپور بھی خانوادۂ چشتیہ کے بزرگوں کے فیض سے محروم نہیں رہا۔ احمد پور شرقیہ میں حضرت خواجہ گل محمد احمد پوری جو حضرت خواجہ محمد عاقل کے مرید و خلیفہ تھے۔ روحانی تعلیمات کے ایک منبع کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے احمد پور شرقیہ میں ایک دینی مدرسہ قائم کروایا تھا۔ یہاں طلباء علوم دینی کے ساتھ ساتھ روحانیت کے اسرار و رموز بھی سیکھتے تھے۔ آپ کا علمی کارنامہ تکملہ سیر الاولیاء ہے۔ جو سید محمد المعروف بہ میر خورد کی مشہور تصنیف سیر الاولیاء کا تکملہ ہے۔ اس میں سلسلہ نظامیہ فخریہ کے بزرگانِ کرام

بالخصوص اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ قاضی محمد عاقلؒ کے خونوادۂ جلیلہ کے مفصل حالات اور ملفوظات درج کئے گئے ہیں۔
اُن بزرگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ اور اُنکے منتسبین جن کے مزارات بہاول پور ڈویژن کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خانوادۂ چشتیہ سے منسلک تھے۔ اور بہاول پور کی روحانی ترقی میں ان سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مختار احمد پیرزادہ

عرس کیوں منائے جاتے ہیں

عرس کیوں منائے جاتے ہیں؟ یہ سوال اس مادی دور میں عہدِ ماضی کی نسبت زیادہ غور طلب ہے۔ معاشرے کا ذہن کچھ اس انداز میں بدلا جا رہا ہے کہ نہ صرف موجودہ نسل معرفت، روحانیت اور اولیاء اللہ کے روحانی فیوض و برکات سے دور ہوتی جا رہی بلکہ موجودہ نسل سے پہلے کے لوگ بھی بزرگانِ دین کے عرسوں پر حاضری، انکساری اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ عبادات اور تلاوتِ قرآن کریم کے ذریعے صاحبِ مزار کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کر کے اولیاء اللہ سے روحانی فیوض و برکات حاصل نہیں کرتے۔ اب زیادہ تر عرسوں کو میلے کی حیثیت دی جاتی ہے۔ جہاں دنیاوی دلچسپیوں کے تفریحی مشاغل موجود ہوتے ہیں۔ اور ان مشاغل میں ڈوب کر یہ لوگ اپنا دامن برائیوں سے آلودہ کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور یہ حقیقت بالکل بھول جاتے ہیں۔ کہ ولی اللہ کے عرسوں میں شرکت کرنے کا اصل مدعا کیا ہے۔

ہمارا نصابِ تعلیم جو مغربی تہذیب سے آج تک متأثر ہے۔ اس کی وجہ سے موجودہ نسل مادی فکر و نظر رکھنے والے دانشوروں کے یوم بڑے اہتمام اور بڑے جوش و خروش سے مناتی ہے۔ ایسی تقاریب میں ان دانشوروں کی تعلیمات اور ان کی خدمات اور نظریات پر مضامین پیش کئے جاتے ہیں۔ انعامی مقابلے رکھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان دانشوروں پر باقاعدہ ریسرچ کا کام ہوتا ہے۔ لیکن ان بزرگانِ دین کی تصانیف و تعلیمات اور ان کی خدمات پر کوئی باقاعدہ توجہ نہیں دی جاتی۔ جنہوں نے اس برصغیر میں اسلام کا پرچم بلند کیا۔ دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دور دراز کے سفر کی تکالیف برداشت کیں۔ اپنی طرف سے مسلمان قوم میں اسلامی روح کو زندہ جاوید رکھنے کیلئے بہترین تصانیف کا سرمایہ تیار کیا۔ روحانی تربیت کے تمام طریقے بتائے۔ کفر و الحاد کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جانیں قربان کیں اور برصغیر میں دور دور تک اسلام پھیلا دیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ ولی اللہ کے نزدیک خانقاہوں کی کیا اہمیت تھی۔ حضرت خواجہ خدا بخشؒ جن کا لقب محبوب اللہ ہے۔ آپ نے اپنے پیرو مرشد حضرت حافظ جمال اللہ ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار نہ صرف اپنی

ذاتی کوشش سے تعمیر کرایا۔ بلکہ اپ باوضو حافظ جمال اللہ رحمت اللہ علیہ کی خانقاہ مبارکہ کی تعمیر میں خود اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے اور آپ نے ان کی وفات کی تاریخ پر باقاعدہ عرس کا سلسلہ جاری کیا۔ بزرگانِ دین جو تصوف کے مختلف سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے وہ باقاعدہ عرسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اور رسوماتِ عرس کو بڑے ادب، عاجزی اور انکساری سے سرانجام دیتے تھے۔ ان بزرگان دین کی زندگی رشد و ہدایت کا سرچشمہ تھی۔ ان کے اخلاقِ حسنہ نورِ نبوت سے روشن اور مزین تھے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں دور دور سے چل کر عرسوں میں ان بزرگانِ دین کی پاکیزہ صحبت کا فیض حاصل کرنے آتے تھے۔ گویا عرسوں کی تقریب کے ذریعے بزرگانِ دین لوگوں کے دلوں میں اعمالِ صالح کی جوت جگاتے تھے۔ انہیں برائیوں سے دامن بچانے کی تلقین کرتے تھے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی کا نمونہ ان کے سامنے پیش کر کے انہیں اس بات کا براہ راست موقع فراہم کرتے تھے۔ کہ پاکیزہ زندگی کیسے گذاری جاتی ہے۔ عبادات میں دل کو کیسے سکون ملتا ہے۔ اخلاقِ حسنہ کیا ہوتے ہیں۔ معراجِ انسانیت شریعت اور طریقت کے ذریعے کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جب اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے تھے۔ ان کی روح، ان کا کردار دنیا کی بیشمار الائشوں اور گناہوں کی بے پناہ کثافتوں سے پاک ہوتا تھا۔ وہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کی حقیقی روشنی سمیٹ کر جاتے تھے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سوز و گداز سے ان کی آنکھیں پرنم ہوتی تھیں۔ اور صاحبِ مزار کی تعلیمات کا ان کے دل پر یہ اثر ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیر و مرشد کے تصور میں ایک جذب کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔

جب سے لوگوں میں بزرگانِ دین کی صحبت سے نیکی کا فیض حاصل کرنے کا جذبہ ختم ہوا ہے لوگ یا تو سفاکی اور درماندگی کی طرف رواں دواں ہیں یا رہبانیت کیطرف بڑھ رہے ہیں۔ مغربی دنیا میں اب یہ احساس روز بروز بڑھتا جارہا ہے کہ روح کی تسکین بہت ضروری ہے اور بہت سے لوگ دنیا کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود ساختہ عبادت کے طریقوں کو استعمال کر کے روحانی تسکین کے متلاشی ہیں۔ اگر ہم اپنی کوششوں سے ولی اللہ کی زندگی کے منور گوشے، ان کے اعمال اور ان کے وہ طریقے جو روح کی تسکین اور اللہ کی پہچان کا ذریعہ تھے۔ آج کی بھٹکی ہوئی دنیا کے سامنے ایک مربوط اور باقاعدہ طریقے سے مختلف تصانیف اور مضامین کی صورت میں پیش کریں تو یہ بات بہت حد تک ممکن ہے کہ دوسری قومیں بالکل اسی طرح اسلام کیطرف کشش محسوس کریں۔ جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے صوفیاء کرام کی تعلیمات اور ان کے اعمالِ صالح کو دیکھ کر اسلام میں دلچسپی لی تھی۔ اور نورِ اسلام سے اپنے دلوں کو منور کیا تھا۔

آج کل ثقافتی پروگراموں میں لاکھوں روپے خرچ کیے جارہے ہیں۔ اور ایک اسلامی ملک میں ثقافت کو ناچ اور گانے سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ حالانکہ ہماری ثقافت کا صحیح مفہوم اسلام کے لازوال اصولوں پر عمل کرنے اور ان کو پھیلانے میں پایا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ خانقاہیں اسلامی ثقافت کا مرکز ہیں اور یہ عرس اسلامی ثقافت کو پھیلانے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہیں۔ ہر ایک ولی اللہ کے یوم وفات پر عرس

کی آج بھی ہمیں یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم مواعظ اور رسومات کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی محبت بیدار کریں۔ ان کے دل ذکرِ الٰہی کی طرف مائل ہوں۔ وہ اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کریں۔ اللہ کی اس زمین پر شر پھیلانے سے گریز کریں۔ دلوں میں خدا کا خوف محسوس کریں۔ ایک دوسرے کے حقوق کو پامال نہ کریں۔ انسانیت کی بلندی اعمالِ صالح میں ہے۔ اور اعمالِ صالح بزرگانِ دین کی صحبت کے فیوض سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ وہ ثقافت جو انسان کو اخلاقی بے راہ روی کی طرف لے جاتی ہے اس کی باقاعدہ سرپرستی ہوتی ہے اور بزرگانِ دین کی خانقاہیں آج تک کسی خاص توجہ کی مستحق نہیں سمجھی جا رہیں اور یہ خانقاہیں جو بھٹکی ہوئی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے بنانے اور سنوارنے ان کی فلاح و بہبود اور ان کی سرپرستی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

دینِ اسلام میں ہر مدرسۂ فکر کے علماء اس مسئلہ پر متفق نظر آتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی قبور کو مقامِ عبرت کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان قبور پر عبرت حاصل کرنے کے خیال سے جائے اور ان کی قبور پر فاتحہ پڑھے تو اس طرح بزرگانِ دین اس کی دعاؤں کو بارگاہِ ایزدی میں مقبول کرانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اسے اپنے روحانی تصرف سے نوازتے ہیں۔ یہ ان بزرگان کی اپنی روحانی کشش ہے کہ صدیوں سے لوگ عرس کے موقع پر آتے ہیں اور رات دن قرآنِ کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ مزاروں پر پھولوں کی بارش کی جاتی ہے۔ لوگوں کی ولی اللہ کرام کی ذات بابرکات کے ساتھ یہ والہانہ وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دورِ زبوں کار میں بھی لوگ صراطِ مستقیم کی تلاش میں ہیں۔ انہیں کوئی خواجہ خدا بخشؒ جیسا رہبر چاہیے جو اپنے علم کی قوت، روحانیت کی کشش اور اخلاقِ حسنہ کی روشنی سے انہیں گناہوں کی تاریکیوں سے نکال کر مذہب اسلام کی ان روشن راہوں میں لے آئے جہاں ؎

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

رشید عثمانی

سلسلۂ چشتیہ اور سہروردیہ کا باہمی ربط

برِ صغیر ہند و پاک میں اسلام کی ضیاء پاشیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ متعدد بزرگانِ دین مختلف مقامات پر تبلیغِ دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ بالخصوص لاہور اور اس کے نواح میں حضرت شیخ اسماعیل بخاری اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کی تبلیغی مساعی کی بدولت اسلام کا بڑا گہرا اثر ہو چکا تھا۔ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری ہندوستان میں ایک زبردست روحانی اور سماجی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اور دینِ حق نے اس سرزمین میں ایک ہمہ گیر حیثیت اختیار کر لی۔ حضرت معین الدین سنجری اجمیری سلسلۂ چشتیہ کے پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے اپنے مرشد کی ہدایت پر تبلیغِ دین کے لئے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ سیر الاولیاء میں ہندوستان کا اس وقت نقشہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

تمام ہندوستان کفر و شرک اور بت پرستی کا مسکن تھا۔ ہندوستان کے متکبروں میں سے ہر شخص اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو اللہ جل شانہٗ کا شریک سمجھتا تھا۔ اور وہ لوگ پتھر ڈھیلے درخت، گائے اور اس کے گوبر کو سجدہ کرتے تھے۔ اور کفر کی تاریکی سے ان کے دلوں کے تالے اور بھی مضبوط ہو رہے تھے۔ غرض ؎

ہمہ غافل از حکم دین و شریعت ہمہ بے خبر از خدا و پیمبر
نہ ہرگز کسے دیدہ ہنجار قبلہ نہ ہرگز شنیدہ کس اللہ اکبر

حضرت غریب نواز جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے اپنے عہد کے جلیل القدر اولیائے کرام اور مشائخ عظام سے فیوض و برکات حاصل کئے۔ جب آپ نوجوانی میں خراساں کی پہاڑیوں پر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول تھے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی پیرانِ پیر نے بغداد کی ایک مجلس میں فرمایا۔

"میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے"

حضرت معین الدین نے اس آواز کو سنا۔ اور آپ کی گردن اتنی جھک گئی کہ پیشانی زمین کو چھونے لگی۔ آپ نے فرمایا "آپ کا قدم میری گردن پر ہے۔"

جب آپ نے بغداد میں حضرت پیرانِ پیر کی خدمت میں حاضری دی تو پانچ ماہ تک آپ کے ساتھ عبادات میں مشغول رہے۔ حتیٰ کہ ۵۷ دن تک آپ کے ساتھ ایک ہی حجرے میں مقیم رہے۔

سلسلہ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے ساتھ بھی آپ کی صحبت رہی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آپ نے شیخ الشیوخ سے استفادہ کیا یا شیخ الشیوخ نے آپ سے استفادہ

کیا۔ سلسلۂ چشتیہ اور سہروردیہ کا یہ ربط آگے چل کر ہندوستان میں دونوں سلسلوں میں محبت اور اخوت کا باعث بنا۔

حضرت معین الدینؒ نے اپنے مرشد حضرت عثمان ہارونیؒ کے ہمراہ روضۂ رسول مقبول صلعم پر حاضر ہوئے۔ خواب میں آنحضورؐ کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا "معین الدین" ہم نے تمہیں بحکم الہٰی سلطان الہند مقرر کیا۔ اب تم اپنے مرشد سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کرو"۔

آپ سب سے پہلے لاہور تشریف لائے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر چلہ کشی کی۔ وہاں سے ملتان آئے۔ عرصہ تین سال سے پانچ سال تک یہاں قیام کیا اور مقامی زبانیں سیکھیں۔ یہاں سے دہلی روانہ ہوئے اور کچھ روز بعد اجمیر پہنچ گئے۔ اجمیر کو اس وقت مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں بیسیوں مندر اور تیرتھ تھے دور دور سے ہندو زائرین یہاں آتے تھے۔ یہاں پہنچ کر آپ نے راجہ پرتھوی راج کی مخالفت کے باوجود تبلیغ دین جاری رکھی اور اجمیر کو تبلیغ اسلام کا مرکز بنا دیا۔ اس طرح ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کی دینی خدمات کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلویؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ وغیرہم نے ہندوستان کے ظلمت کدے کو اسلام کے نور سے منور کر دیا۔

ہندوستان میں سلسلہ سہروردیہ کا آغاز حضرت شیخ الاسلام غوث بہاؤ الدین ذکریا ملتانی قدس سرہٗ کے دور سے ہوا۔ آپ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے خرقہ خلافت حاصل کر کے ملتان میں تشریف لائے۔ آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت کا منبع تھا۔ ہزارہا طالبانِ حق ہر وقت یہاں موجود رہتے تھے۔ برصغیر ہند و پاک کے علاوہ جاوا، سماٹرا، سری لنکا اور افریقہ کے بعض علاقوں میں تجارتی وفود بھیجے جاتے تھے۔ جو تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین کی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔

سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ جب ملتان میں تشریف لائے تو آپ کا قیام حضرت بہاؤ الدین ذکریاؒ کی خانقاہ میں رہا۔ دونوں بزرگ ایک ساتھ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہتے تھے۔ اس دوران میں ملتان پر حملہ ہو گیا۔ والیٔ ملتان ناصر الدین قباچہ پریشان ہو کر ان بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور امداد کی التجا کی۔ حضرت کاکی کے ہاتھ میں ایک تیر تھا۔ آپ نے اسے قباچہ کے حوالے کیا۔ اور فرمایا اسے جا کر دشمنوں پر چھوڑ دو۔ ایسا کیا گیا تو دشمن تتر بتر ہو گئے۔

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے بھی یہیں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دست حق پرست پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ بھی سالہا سال تک حضرت بہاؤ الدین ذکریاؒ کے ساتھ رہے۔

حضرت گنج شکر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اور برادرم بہاؤ الدین یکجا بیٹھے تھے۔ میں نے برادرم بہاؤ الدین سے پوچھا۔ آپ نے ریاضت و مجاہدہ میں کہاں تک رسائی پیدا کی ہے"؟

آپ نے فرمایا "ہاں اس قدر کہ جن کرسیوں پر ہم اور تم بیٹھے ہیں۔ اگر میں کہوں تو ابھی ہوا میں پرواز کرنے لگیں"۔ اتنی بات حضرت کی زبان سے نکلی ہی تھی کہ دونوں کرسیاں زمین سے اٹھ کر ہوا میں پرواز

کرنے لگیں۔ حضرت بہاؤ الدینؒ نے کرسیوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور فرمایا "یہ گفتگو برسبیل تذکرہ تھی۔ سبیل ارشاد نہ تھی۔ تم اپنی جگہ قائم رہو" سلسلہ سہروردیہ کے دوسرے بزرگوں حضرت لعل شہباز قلندر۔ اور حضرت جلال الدین سرخ بخاری کے ساتھ بھی روابط میں اضافہ ہوا۔

راحت القلوب میں ہے کہ جس وقت حضرت شیخ بہاؤ الدین کا وصال ہوا۔ اس وقت اجودھن میں بابا فرید بیہوش ہو گئے۔ بڑی دیر کے بعد ہوش آیا۔ تو فرمایا "برادرم بہاؤ الدین ذکریا را ازیں بیابان فنا بہ شہرستان بقا بردند" اور پھر اٹھ کر مریدوں کے ساتھ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ دونوں بزرگوں کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ حضرت فرید الدین گنج شکر کو حضرت بہاؤ الدین نے ایک رقعہ بھیجا۔ اس میں لکھا۔

"میانِ ما وشما عشق بازی است"

آپ نے جواب میں لکھا۔

"میانِ ما وشما عشق است بازی نیست"

سلطان التمش کے عہدِ حکومت میں حضرت ذکریاؒ شیخ الاسلام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ سلطان التمش بذاتِ خود ایک باکمال ولی تھا۔ جب حضرت بختیار کاکیؒ کا وصال ہوا تو آپ نے وصیت کی۔ کہ میری نمازِ جنازہ وہ شخص پڑھائے جس سے عصر کے مستحب قضا نہ ہوئے ہوں۔ جنازہ کے یہ وصیت لوگوں کو بتا دی گئی۔ بڑے بڑے باکمال عابد و زاہد موجود تھے۔ لیکن یہ سعادت سلطان التمش کو نصیب ہوئی۔ آگے بڑھ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر حضرت کی چارپائی کے نزدیک جا کر روتے ہوئے کہا "حضرت آپ دنیا سے پردہ پوش ہو گئے اور مجھے بے پردہ کر گئے۔

سلسلہ چشتیہ اور سہروردیہ کے بزرگوں کے اس ربط نے آگے چل کر دونوں سلسلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ اور ایک سلسلے کے بزرگ دونوں سلسلوں میں بیعت لینے لگے۔ سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ کا ربط حضرت رکنِ عالمؒ اور حضرت نظام الدین اولیاء دہلویؒ کے وقت میں اور زیادہ مضبوط ہوا۔ سیر العارفین میں ہے۔

ایک بادشاہ رکنِ عالمؒ اور حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت بابا فرید گنج شکر کے عرس میں حاضر تھے۔ جب قوالوں نے راگ شروع کیا تو حضرت نظام الدینؒ کو وجد و حال طاری ہوا۔ چاہا کہ کھڑے ہو جائیں۔ حضرت رکن عالم نے فوراً آپ کا دامن پکڑ لیا اور اٹھنے نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت نظام الدین اولیاء بقصد کھڑے ہو گئے۔ اس بار آپ نے نہ روکا۔ بلکہ خود بھی دست بستہ اور مشائخ کی طرح مؤدب کھڑے رہے۔ سماع ختم ہونے کے بعد جب آپ اپنے مقام پر واپس آئے تو حضرت علم الدین علامہ نے عرض کیا کہ یا مخدوم اس کا کیا سبب ہے۔ کہ پہلی بار جب سلطان المشائخ بغرض تواجد اٹھے تو آپ نے اٹھنے نہ دیا اور جب دوسری بار اٹھے تو آپ نے باز نہ رکھا۔ فرمایا "میں نے پہلی بار حضرت سلطان المشائخ کو عالمِ ملکوت میں پایا۔ وہاں تک میرا ہاتھ پہنچا اور دوسری بار عالمِ جبروت میں دیکھا۔ اس لئے دست بردار ہوا۔

اخبار الاخیار میں ہے۔ کہ شاہ رکن عالمؒ سلطان قطب الدین بن علاؤالدینؒ کے زمانے میں دہلی تشریف لائے تھے۔ حضرت نظام الدینؒ اس وقت مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز تھے۔ آپ کے استقبال کے لئے اپنی خانقاہ سے حوض خاص طلائی تک جو شہر دہلی میں واقع ہے تشریف لائے۔ جب شاہ رکن عالم نے سلطان قطب الدینؒ کی مجلس کو مشرف کیا تو اس نے دریافت کیا کہ اہلِ شہر میں سب سے پہلے کس شخص نے آپ کا استقبال کیا۔ فرمایا "جو شخص اہلِ شہر میں بہترین ہے۔ سلطان قطب الدین کو شیخ نظام الدینؒ سے عداوت تھی اور بعض کہتے ہیں۔ کہ شیخ رکن الدینؒ کو بلانے سے اس کا مقصد حضرت نظام الدینؒ کی تحقیر اور کسرِ شان تھی۔ لیکن شیخ رکن الدینؒ اس کلام سے اس کے وہم کو مٹا دیا اور اس کو اس توقع سے محروم کر دیا۔

اخبار الاخیار میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ حضرت شیخ نظام الدینؒ اولیاء کی عیادت کو دہلی تشریف لے گئے اور فرمایا کہ یہ عشرہ ذوالحجہ ہے۔ ہر شخص سعادتِ حج حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن میں نے شیخ المشائخ کی زیارت سے مشرف ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد جب شیخ نظام الدین اولیاؒ رحلت فرما گئے تو آپ نے انکی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسی نعمت کے حصول پر فخر کرتے تھے۔ دونوں سلسلوں کا باہمی ربط بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں نقطۂ عروج پر رہا۔

صاحب اولیائے ملتان نے "تحفۃ الابرار" کے حوالے سے لکھا ہے۔ ایک دفعہ مقام دہلی ذکر ہوا۔ کہ ملتان میں یہ عظمت حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ قدس سرہٗ کسی ولی کا تصرف پیش نہیں جاتا اور کوئی شخص وہاں بیعت نہیں کرتا۔ حضرت مولانا شاہ فخرالدین دہلوی نے فرمایا۔ میاں نور محمدؒ اب تک ملتان میں حضرت بہاؤالحق صاحب کی ولایت تھی۔ لیکن اب ملتان ہمارے حوالے ہو گیا ہے۔ لازم ہے کہ اپنے مریدوں میں سے کسی کو وہاں بھیجو کہ عین خانقاہ حضرت بہاؤالدین ذکریا میں لوگوں کو مرید کرے اور اپنا تصرف کرے۔ چنانچہ قبلہ عالم حضرت نور محمدؒ مہارویؒ نے حضرت حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کو سمتِ ملتان روانہ فرمایا اور آپ نے خانقاہ حضرت بہاؤالحق میں حضرت خدا بخش قتانی ثم خیرپوری کو مرید کیا جو آپ کے خلفائے نامدار میں ممتاز تھے۔

یہی وہ حضرت خواجہ خدا بخشؒ ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے عبادت و ریاضیت میں کمال حاصل کرتے ہیں کہ حضرت قبلہ عالم مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے موقع پر آپ ہی نے آپ کی وصیت کے مطابق حضرت قبلہ عالمؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

یہی وہ خواجہ خدا بخشؒ ہیں جو مسجد میں بیٹھے ہوئے شاگردوں کو معراج کے بارے میں واقعات بیان کر رہے ہیں۔ ایک شاگرد نے کہا۔ حضرت یہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضورؐ آسمان میں سے گذر گئے۔ جبکہ آسمان کا کوئی دروازہ نہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ میاں یہ تم نبی کے بارے میں یہ بات کہہ رہے ہو۔ حالانکہ یہ کام تو فقیر خدا بخش بھی کر سکتا ہے۔ آپ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد کے محراب میں سے باہر گذر گئے اور پھر اندر آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

سلسلہ چشتیہ اور سہروردیہ کے باہمی ربط سے تبلیغ دین کی عظیم الشان خدمات انجام دی گئیں۔ برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کے معتقدین بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کے معتقدین برصغیر کے علاوہ ملائشیا، انڈونیشیا، لنکا اور افریقہ کے بعض علاقوں میں ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کے بزرگان کا رابطہ شاہانِ وقت سے رہا۔ یہ بزرگان بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز رہے اور عوام الناس کی تکالیف شاہانِ وقت تک پہنچاتے تھے اور ان پر احکامات حاصل کرتے تھے۔ جبکہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگان شاہانِ وقت سے دور رہے۔ اور خانقاہوں میں رہ کر رشد و ہدایت کے چشمے جاری رکھے۔

فضل اللہ زبیری
ایم اے، ایم ایڈ

تصوف کیا ہے؟

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

سامعینِ کرام!

اللہ رب العزت فرماتے ہیں۔ کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں۔ جو زمین پر عجز و انکساری سے چلتے ہیں اور اکھڑ لوگ ان کو مخاطب کرتے ہیں تو وہ نرمی سے جواب دیتے ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ میں انسانوں کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کے بنیادی اوصاف عجز و تحمل ہیں۔ ان اوصاف سے متصف لوگوں کو رحمٰن کے بندے کہا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ اللہ کے خاص اور مقرب بندوں کی توصیف ہے۔ جن کو عرفِ عام میں اولیاءُ اللہ کہا جاتا ہے۔ مقامِ ولایت پر پہنچنے کے لئے چار منازل سے گذرنا پڑتا ہے۔ شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت۔ ان منازل کو طے کرنے کیلئے جو نصابِ تعلیم ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک عملی تربیت یا سلوک اور دوسرا علمی مباحث یا تصوف ہے۔ تصوف ایک نقطۂ نظر بھی ہے اور زندگی کا لائحۂ عمل بھی ہے۔ علمائے تصوف نے اس کی تعریف متنوع الفاظ میں کی ہے۔ مثلاً ابو عمرو دمشقی کا قول ہے۔ التصوف رؤیۃ الکون بعین النقص بل غض الطرف عن الکون۔ یعنی تصوف موجودات کو نقص کی نظر سے دیکھنا بلکہ ان کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ہے۔ حضرت ابو الحسن نوری نے کہا ہے۔ التصوف ترک کل حظ للنفس۔ گویا نفس کی ہر لذت کو چھوڑ دینا تصوف ہے۔ حضرت حصری رح فرماتے ہیں۔ التصوف صفاءُ السرّ من کدورۃ المخالفۃ اس کا مطلب ہے کہ باطن کو مخالفِ حق کی آلودگی سے پاک کر لینا تصوف ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی بڑی جامع تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں۔ التصوف مبنی علی الثمان خصالِ السخاءِ والرضا والصبر والاشارۃ والغربۃ ولبس الصوف والسیاحۃ والفقر۔ یعنی تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتیں ہیں۔ سخاوت، رضا، صبر، اشارہ، لباسِ صوف، سیاحت اور فقر۔ انہوں نے ان صفات کو انبیاء کرام سے منسوب کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ سخاوت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع ہے کہ انہوں نے اپنے جگر گوشے تک کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ رضا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیروی ہے۔ انہوں نے حکم خداوندی جان دینا بخوشی گوارا کیا۔ صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی اقتدا ہے جنہوں نے انتہائی بیماری اور تکلیف میں صبر کیا۔ اشارہ کو حضرت زکریا علیہ السلام سے منسوب کیا کہ ایک موقع پر تین دن تک زبان بند رہی اور وہ اشاروں سے خدا کو یاد کرتے تھے۔ یہ نکتہ تھوڑا سا وضاحت طلب ہے۔ واقعہ یوں ہے۔ کہ

حضرت زکریا علیہ السلام لاولد تھے۔ جب انہوں نے حضرت مریم کا واقعہ دیکھا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت ایک کھجور کا سوکھا ہوا تنا سرسبز ہوگیا۔ اور اس میں پھل آگئے۔ تو دعا کی۔ مولا تو سوکھے تنے کو بار آور کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ مجھ ضعیف کو بھی اس بڑھاپے میں ثمر اولاد عطا فرما۔ تو وحی آئی کہ تم پر تین دن خاموشی کے آئیں گے۔ اس حال میں جب اشاروں اشاروں میں دعا مانگو گے تو قبول ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بیٹے کی بشارت ملی۔ جس کا نام یحییٰ یعنی زندہ رہنے والا رکھا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں ہے۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَاءً خَفِيًّا۔ پانچویں خصلت غربت ہے۔ جو حضرت یحییٰ علیہ السلام سے منسوب ہے کہ اپنے وطن میں رہ کر بھی بے وطن تھے۔ اسی طرح سیاحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور لباس صوف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی ہے۔ آٹھویں اور آخری خصلت فقر حضرت خاتم المرسلین محبوب رب العلمین جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ لفظ تصوف اصحاب صفہ کے اندازِ فکر اور طرزِ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ مغربی مستشرقین نے اس پر تنقید بھی کی ہے۔ اور تصوف کو فرار کا فلسفہ قرار دیا ہے۔ آرنلد کہتا ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کی ستم ظریفیوں اور شاہ اسماعیل صفوی کے ظلم وستم نے جو خوف وہراس اور مایوسی کی فضا پیدا کی اس سے مسلمانوں میں ترکِ دنیا۔ گوشہ نشینی، چلکشی و ریاضت، بدنی موت کو زندگی پر ترجیح دینا وغیرہ فضائل پیدا ہوئے۔ جن کا مجموعہ ایک فلسفۂ زندگی بن گیا۔ یہ لوگ صوف کا لباس پہنتے تھے۔ اس لئے صوفی کہلائے۔ یہ نظریہ مادیت پسند اذہان کے لئے کیسا ہی قابلِ قبول کیوں نہ ہو۔ ہم روحانیت پسند مسلمان اس کو مسترد کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم صاف بتا رہا ہے۔ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ۔ "خبردار اولیاء اللہ کے لئے نہ خوف ہے۔ نہ وہ غمگین ہونگے۔ یہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے ہیں۔ ان کے لئے دنیوی زندگی اور آخرت میں خوشخبری ہے"۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

اَلَا اِنَّ فِى الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِىَ الْقَلْبُ "بے شک آدمی کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے۔ سن لو وہ قلب ہے"۔ گویا قرآن وحدیث کی روشنی میں تصوف کی اہمیت اور اس فلسفۂ زندگی کی غایت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ سراسر تقویٰ کی تعلیم ہے۔ جو اخروی نجات کا ذریعہ ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت پر طویل مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں میں چند بزرگان کے اقوال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ابو حفص نیشا پوری کا قول ہے۔ "التصوف کلہٗ اٰداب ولکل وقتٍ ادبٌ ولکل مقامٍ ادبٌ فمن لزم اداب الاوقات بلغ مبلغ الرجال ومن ضیع الاداب فھو بعیدٌ من حیث یظن القرب و مردودٌ من حیث یظن القبول۔ یعنی تصوف سارے کا سارا ادب ہے۔ ہر وقت و مقام حال کے لئے ادب ہے۔ جو شخص اوقات کے اداب بجا لاتا ہے۔ وہ مردانِ راہِ حق کا مرتبہ پاتا ہے اور جو اداب کو ضائع کرتا ہے وہ خواہ خود کو کتنا ہی قریب سمجھے حقیقت سے دور ہوتا ہے اور مردود ہوتا ہے۔ حضرت ابو الحسن نوری

فرماتے ہیں۔ "لیس التصوف رسوماً ولا علوماً ولکنہ اخلاقاً" یعنی تصوف صرف رسوم اور علوم کا نام نہیں بلکہ یہ اخلاق حسنہ کا نام ہے۔"

اگر بہ نظرِ عمیق تصوف کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ اعمال ظاہرہ کے لئے ضابطۂ فقہ ہے۔ اسی طرح اعمالِ باطنہ کا ضابطۂ تصوف ہے۔ اور ان اعمالِ باطنہ ہی کو تو طریقت کہتے ہیں۔ جس سے قلب کو جلا ہوتی ہے۔ اس سے جو اسرار واضح ہوتے ہیں۔ ان کو حقیقت کہتے ہیں۔ اور اس انکشاف کا دوسرا نام معرفت ہے جو درجۂ ولایت کا زینہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان بزرگان دین سلف صالحین اولیاء کرام اور پیشوایان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ جنہوں نے تزکیۂ باطن کی تعلیم کے لئے زندگیاں وقف کر دیں ان میں ایسے بھی بزرگ ہیں۔ جو تصوف کے امام مانے گئے ہیں اور ان کے اسمائے گرامی کی نسبت سے سلسلہ ہائے تصوف مشہور ہیں۔ مثلاً پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ان بزرگوں کے قائم کردہ سلسلے قادری، نقشبندی، چشتی اور سہروردی سب برحق ہیں۔ طریقۂ تعلیم میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ مقصد سب کا ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان بزرگوں کے نقشِ قدم پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

عبدالشکور پیرزادہ

اعلائے کلمۃ الحق - اور - اولیاء اللہ

اس موضوع پر غور و فکر سے جو بنیادی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ولی کون ہو سکتا ہے، اور کلمۂ حق کسے کہتے ہیں؟ اولاً میں ولی کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرونگا۔ ثانیاً کلمۂ حق کا تجزیہ اور پھر ولی کا کلمۂ حق کے ساتھ ربط بیان کرنے کے بعد یہ وضاحت کرونگا کہ اس ربط کو معاشرے اور انسان کی فلاح و خیر میں کسقدر اہمیت حاصل ہے؟

ولی کون ھے؟ یہ سوال جب انسان کے ذہن میں سوالیہ دائرے کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو اس دائرے میں ولی کی شخصیت انسانی رنگ و روپ میں سامنے آجاتی ہے۔ ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے وہ انسان ہے۔ عام انسانوں کیطرح۔ خالقِ کائنات کی قوتِ تخلیق کا متحرک اور افعال عکس۔ اس عکس کو ایک وجودی تعین کی حیثیت حاصل ہے جو قوتِ سماعت، قوتِ گویائی، قوتِ باصرہ، قوتِ لامسہ اور قوتِ شامہ سے مزین ہے۔ گویا ان سب توانائیوں کو بروئے کار لاکر وہ سنتا ہے، وہ بولتا ہے، وہ دیکھتا ہے۔ وہ کسی چیز کو چکھنے سے اس کے ذائقہ کی تعین کرتا ہے۔ وہ کو سونگھ کر اس کی خوشگوار اور ناگوار بو میں تمیز پیدا کرتا ہے اس کی یہ تمام فعال کیفیات یہ نشاندہی کرتی ہیں کہ اس عقل و دانش کی روشنی بھی موجود ہے۔ ایک ایسی روشنی جو شعور کو بھی جنم دیتی ہے۔ ایک ایسا شعور جس جوشش و جذبہ کی آمیزش موجود ہوتی ہے۔ صرف آمیزش نہیں بلکہ آویزش بھی۔ مسرت کے جذبات، سرور کی چاشنی پیش کرتے ہیں تو غم کی پریشان کن اور اذیت ناک کیفیات بھی ساتھ ساتھ اضطراب کے بھنور بھی مہیا کر دیتی ہیں۔ رنگین خواہشات اور حسین آرزوئیں اگر مہکتے اور سدا بہار پھولوں کا تصور پیش کرتی ہیں تو برابر میں نکیلے کانٹوں کی چبھن، آبلہ پائی کی سوہانِ روح کیفیت کو بھی ذہن کی پر اجاگر کر دیتی ہے۔

اس عقل و دانش کی روشنی اور انہی عناصرِ اربعہ کی توانائیوں نے افلاطون، ارسطو، سقراط، بقراط، فارابی، بو علی سینا، ابن رشد اور ابوالہزیل جیسے سینکڑوں دانشوروں کی شخصیات کو اپنے اپنے وقت پر انسانی تاریخ میں ابھارا انہوں نے انہی عناصر اربعہ کی توانائیوں کے اٹھتے ہوئے خمیر سے پیدا شدہ شعور کو بروئے کار لاکر اس خوبصورت کائنات [illegible] دی اشکال و اجسام کی ماہیت اور غرض و غایت معلوم کرنے کی ازلبس کوششیں کیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے [illegible] معلومات فراہم کیئے جو رفتہ رفتہ بنی نوع انسان کی مزید غور و فکر کا موضوع بنتے رہے اور جانچ پرکھ کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد نئے سے نئے برگ و بار حاصل کرکے آج وہ

انسان کی مادی ترقی کا محیر العقول اور فقید المثال کارنامہ بن چکے ہیں۔

کیا ہم یہ بہترین تحقیقی اور مفید کارہائے نمایاں انجام دینے والے مندرجہ بالا دانشوروں کو ولی کہہ سکتے ہیں؟ نہیں! ہرگز نہیں!! کیا ولی دانشور نہیں ہوتے؟ کیا یہ دانشور ان عناصرِ اربعہ کی توانائیوں سے بڑی صلاحیت سے معرا ہیں؟ یا ان توانائیوں سے اور ارفع و اعلیٰ یا ماورائے عقل توانائی ولی کی شخصیت میں جذب نظر آتی ہے۔ اور ولی اللہ کو ماورائے انسان کسی مقام پہ پہنچا دیتی ہے۔ نہیں یوں بھی نہیں ہوتا تو پھر وہ حقیقت کیا ہو سکتی ہے جو ایک انسان کو ولی کا درجہ بخش دیتی ہے؟

ولی اللہ کی زندگی پر اگر گہری اور تحقیقی نظر ڈالیں تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ ولی بھی کائنات کا تجزیہ بالکل میکینیکل اور سائنٹیفک انداز سے کرتا ہے۔ یہی سائنٹیفک انداز اسوۂ نبی اور فرمانِ باری کے ہر حرف سے واضح ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کو اس کائنات میں افضل و برتر حیثیت دی۔ یہ افضلیت اور برتری دو بنیادوں پر استوار ہے۔ شعور اور جزوی اختیار و ارادہ کی قوت۔ جزوی اختیار و ارادہ کی قوت کائنات کے خالقِ ذاتِ مقدس کی اعلیٰ و ارفع تخلیقی توانائی سے مشتق ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو کائنات کی کسی دوسری شے کا جزو ہے اور نہ ہی کوئی غیر انسانی وجود اس سے آراستہ ہے۔ یہ انمول موتی صرف انسانیت کی خلعتِ فاخرہ کی تزئین کا بنیادی سرمایہ ہے۔ اس بنیادی سرمایہ کی سدا بہار ٹہنیوں سے انسانی شعور کی کلیاں پھوٹتی ہیں۔ ولی اللہ اپنی اسی قوت کو اپنے مادی وجود میں ترتیب یافتہ عناصرِ اربعہ میں جذب کر کے ذاتِ مقدس سے یقینِ کامل کے ساتھ وابستہ بنا لیتا ہے۔ شعور اور اختیار و ارادہ حیاتِ انسانی میں تحریک یا عمل پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ شعور اور اختیار و ارادہ کی توانائی اگر رضائے ذاتِ مقدس کی تابع بن جائے تو ولی کی شخصیت میں موجود جملہ جبلتیں اپنے فطری تقاضوں کو انتہائی احسن اور شگفتہ انداز میں پورا کرنے کے لئے مستعد ہو جاتی ہیں جس سے تزکیۂ نفس کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ یہ حول جوں نکھرتا ہے اس میں سوز اور جذب و کیف کی لذتیں ولی کی شخصیت میں تنوع پیدا کرتی چلی جاتی ہیں اور اس تنوع میں کلامِ باری اور اسوۂ نبی کا نور ڈھلتا چلا جاتا ہے جس سے ولی کے نالۂ سحرگاہی میں [illegible] ہوتا ہے۔ اس سے اس روح میں الوہی تجلیات سے متصوف چاشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ چاشنی ولی کے کردار [illegible] وہ جذبہ جنم دیتی ہے جو ولی کی شخصیت کو ذاتِ برحق کی جمالی صفات کا عکس بناتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ جذب ہے جو اس راہ نوردِ شوق کو اس کائنات میں کسی منزل پر رکنے یا الجھنے نہیں دیتا۔ لیلیٰ بھی ہمنشیں بن جائے تو پھر بھی یہ محمل قبول نہیں کر سکتا۔ اس جوئے آب کو بحرِ نور کی تند و تیز کشش اپنی جانب کھینچتی چلی جاتی ہے۔ ولی محض عقل کا غلام نہیں رہتا بلکہ ازلی اور ابدی صداقتوں کا پرستار بنتا چلا جاتا ہے۔ حق کی اس پرستش میں اسے جو لذتیں ملتی ہیں وہ اسے کسی ساحل پہ نہیں جمنے دیتیں۔ وہ محفل گداز بنتا جاتا ہے۔ عقل کی گرمی قبول نہیں کرتا بلکہ ولی کے کردار کا جو خمیر اٹھتا ہے۔ اس سے یہ نغمگی بکھرتی ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے ۔۔۔ شرکت میانِ حق و باطل نہ کر قبول

اقبال

ولی کی نگاہ جب دینِ مصطفوی سے کھیلتی ہے۔ تو رموزِ کائنات بھی اس کی عقل و دانش کا حصہ بنتے ہیں۔ ولایت، کردار، عبادت اور ریاضت کی گود میں جب پروان چڑھتا ہے تو ساتھ ساتھ اس میں عبادت اور ریاضت کی تہہ میں عشق کی گرمی اکسیر کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہ اکسیر انسانیت کے اس کردار کو کندن بنا دیتی ہے۔ ایک ایسا کندن جس کو انسانیت کی جبیں پر سجے بغیر تکمیلِ آدمیت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ دمکتا ہوا نورانی کردار جب معرفت کی منزلوں سے گذرتا ہے وہ فطرت کے تمام رموز اور اس کائنات کے مادی پیکروں کی گہرائیوں میں مچلتے ہوئے اسرار اپنی نگاہوں کے ذریعے منعکس کر کے اپنی انا کو ان اسرار پر مسلط کر دیتا ہے۔ یہی انا اس کا فقر ہے۔ یہ فقر اس کائنات کی رنگ و بو کی طغیانی سے بے نیازی بشری افضلیت پر نازاں نظر آتا ہے۔ اس عظیم کردار میں رہبانیت نہیں عقابی پرواز کی لذت آفرینیاں چٹکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کردار میں یہ اعتماد نظر آتا ہے کہ اس کے جزوی اختیار و ارادہ کی قوت ذاتِ برحق کی قوتِ تخلیق کے تابع بن کر روحانی رشتوں میں منسلک ہو چکی ہے۔ یہ خود اعتمادی اس کی عقل و دانش کو محض پیکروں کی پرستار عقل سے منفرد بنا دیتی ہے۔ اسطرح کی منفرد کہ اس کی انفرادیت اس کائنات کے ظاہر اور باطن میں ایک مضبوط رشتے کو نمایاں کرنے کی ایک واضح کڑی معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسی واضح کڑی جس کو نہ افلاطون بنا سکا ہے۔ نہ بقراط، نہ سقراط اور نہ ارسطو۔ ان دانشوروں کی نگاہ جب اٹھتی ہے۔ تو اس کائنات کی آغوش میں بکھرے ہوئے مادی موجودات سے ٹکراتے ہی الجھ کر رہ جاتی ہے۔ مگر ولی کی نظر جب اٹھتی ہے۔ تو دل و وجود کو چیر کر رکھ دیتی ہے۔ وہ اس لئے کہ اس ولایت کے کردار میں مخفی روحانی قوت روح القدس کے ذوقِ جمال میں ڈھل کر آدمیت کی اولوالعزمی کا مواد بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اقبالؒ نے اس طرف نگاہ اٹھائی تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطون

عقل و دانش کے متوالے اور علم و ہنر کے شاہوار محض عقل اور ذوقِ کاریگری، صنعت گری کے سرور میں مادی تخلیقات پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان تخلیقات کی حیثیت مفید ہونے کے ساتھ فانی ہے۔ آج کا تجربہ اور مشاہدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان تخلیقات اور ایجادات کی افادیت بھی بنی نوع انسان کے کردار پر منحصر ہے۔ یہ کردار اگر ہلاکو اور چنگیز خاں کے روپ میں ابھرے یا ہٹلر کا جامہ پہنے تو یہ ایجادات انسانیت پر ناگہانی آفت بن کر گرتی ہیں۔ انسانی عقل و دانش کی عیاری اور صفت روباہی انسانیت کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن ولی کا کردار رب ذوالجلال کی جمالی صفات کا مظہر بنتے ہوئے اس کائنات کی تہوں سے انمول موتی جمع کر کے اپنی گداز اور نورانی شخصیت کی جھولی میں بھر کر لاتی ہے اور انسانیت کا حسن بن جاتی ہے۔ اقبال اسی وجہ سے کہتا ہے۔

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

ولی کی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ دلق پوش ہے لیکن جب معاشرتی عمل میں یہ کردار آفتاب و مہتاب کی کرنیں لٹاتا ہے تو شاہوں کا جاہ و جلال مہرِ اخرِ شب کی سسکیاں ہوتی دکھائی دیتا ہے۔ واہ! سے

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیئے

مسکین خدابخش ہے یا فقیر خدابخش تو اس کی اسما روش میں انسانی عجز و انکساری کے انداز ہیں۔ لیکن اس ولی کے کردار کی عظمت کو ان کی پرشکوہ زندگی کے واقعات میں پرکھا جائے تو اس نیرپور کی سرزمین گواہ ہے۔ کہ یہاں جب یہ شخصیت دھوپ کی کرنوں میں عیاں ہوتی تو اس شخصیت کا وجود عشقِ رسول میں یوں گداز اور لطیف پایا گیا کہ سورج کی کرنیں اس جسم کو چھوتی ہوئی جیسے گذریں تو اس وجود کا سایہ تک عقل و دانش سے مزین عام انسان کی نظروں میں واضح نہ ہو سکا۔ اور اس طرح یہ عقدہ بھی وا ہوا کہ وہ

ارتباطِ حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ ولی انسانیت کا وہ پرشکوہ کردار ہے۔ جس میں عقل و دانش کی عظمتیں بھی ہیں اور روح کی بالیدگی بھی ہے۔ ایسی بالیدگی جس میں کلامِ باری اور اسوہ نبی کا نور کارساز و کارفرما ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ ولایت کے ایسے کردار کے بغیر آدمیت کی تکمیل ممکن ہی نہیں اگر آدمیت اور بشریت کی تکمیل نہ ہوئی تو تنزل پذیر دنیا میں یا مادی ترقی یافتہ کائنات تا قیامت انسانیت کو امن و سکون اور حسن بخش ہی نہیں سکتی جو یقیناً زیبِ انسانیت ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے سے

زمانہ لے کے جنہیں آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

ولی کی اس تعریف کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ کلمۂ حق کسے کہتے ہیں۔

کلمۂ حق

کلمۂ حق وہ ہے جو اپنی بنیادیں حقائقِ ابدی پر استوار رکھے۔ حقائق ابدی وہ ہیں جن کا تعلق اس کائنات کے ظاہر اور باطن سے مکمل طور پر جڑا ہوا ہو۔ یہی وہ تعلق ہے۔ جسے احسنِ تقویم سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی لازوال صداقتیں اس کائنات کی مادی خوبصورتی بھی ہیں اور انسانی کردار میں سیرت کا نام بھی پاتی ہیں۔ یہی سیرت اور یہی صورت انسان اور کائنات کے باہمی ربط کی قدر مشترک بھی قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ کائنات ہے یا انسان۔ کائنات کا وجود ممکن مادی ہے۔ انسان کا وجود مادے اور روح پر مشتمل کائنات کی وسعت بھی بے پایاں اور انسان کی شخصیت بھی انتہائی گہری۔ یہ کائنات انسان کے لئے ہے اور انسان کائنات کے لئے۔ اب حق یہ ہے کہ انسان اور کائنات کی خالق قوت ذاتِ مقدس ہے۔ ذاتِ مقدس نے انسان کو اس کائنات کا حسن بنا دیا ہے۔ یہ حسن کس طرح نکھر کر اس کائنات کو اور انسان کے معاشرتی عمل کو صحیح معنوں میں مربوط بناتے ہوئے اس کائنات کی تابندگی اور انسانیت کی تب و تاب بنا ہے؟ وہ اس طرح کہ انسان صرف اور صرف اسوۂ انبیاء اور احکام ذاتِ مقدس میں ضم ہو کر رہ جائے۔ اس طرح ضم ہو جانے کے بعد وہ صراطِ مستقیم مل جاتی ہے جو اس کائنات کی گہرائیوں سے گذرتی ہوئی مادے کے جملہ اسرار و رموز کو

روحانیت میں مخفی الوہی توانائیوں سے ملا کر ایک کر دیتی ہے۔ اس بنیادی اور ابدی صداقت کی بنا پر جب انسان کا کمالِ ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ تو کائنات اپنی جھولی سے جملہ انمول موتیوں کی مالا پرو کر انسانیت کے گلے میں پہنا دیتی ہے۔ یوں یہ انسان اس کائنات کا افضل و برتر بن کر شوکتِ شاہانہ کا خوبصورت نمونہ قرار پاتا ہے۔ جس سے تخلیقِ آدمیت کا حقیقی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کو بروئے کار لانے کی خاطر انسان مسجودِ ملائک قرار دیا گیا۔

اس سے ہٹ کر شر کی راہ شروع ہوتی ہے۔ شر کو روکنے کی غرض سے اسوۂ انبیا اور احکاماتِ الٰہیہ کو بروئے کار رکھنے کیلئے جو کچھ بھی بلا خوف و خطر کیا جائے وہ اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ یہ اعلائے کلمۃ الحق ولی اللہ کی زندگی کا وہ طرۂ امتیاز ہے۔ جسکو سامنے لانے کے لیئے ذبیح اللہ کی گردن مبارک کو چھری کے نیچے لایا گیا۔ اس عظیم کردار کو نمایاں کرنے کے لئے عشقِ حقیقی کا وہ والہانہ پن سامنے آیا۔ جس نے نمرود کی دہکتی ہوئی آگ کو گل و گلزار بنا دیا۔ یہی وہ عظمت ہے۔ جس نے حسین ابن علی کے پاکیزہ خون سے کربلا کی ریت کو سینچ دیا۔ تاکہ اس ریت کا ہر ذرہ تا قیامت اس عظیم کردار کی وہ علامت بنا رہے۔ جس نے فتح و شکست کے پیمانے بدل دیئے۔ جسمیں وہ چمک پیدا ہو جسے تا قیامت آفتاب و مہتاب کی کرنیں جھک کر سلام پیش کرتی رہیں۔ اور یوں اس کائنات میں اعلائے کلمۃ الحق کا بول بالا رہے۔

کاتب :- عبدالشکور پیرزادہ خیرپور شریف (ٹامیوالی)